جنت کے آنسو

تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور و کراچی

جنّت کے آنسو

مصنّفہ

ظہور ملک

ناشران

تاج کمپنی لمیٹڈ۔ قرآن منزل ریلوے روڈ

لاہور

فہرس

مُبارک احمد کے نام

"حرفِ آغاز"

"جنّت کے آنسو" میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے ؛
اِن افسانوں کے اکثر موضوع میں نے مشاہدات اور
ان سے پیدا ہوتے ہوئے داخلی واردات سے لئے ہیں،
پچھلے چند برس میں زندگی کے بے پناہ تیز رفتاری، پل
پل میں بدلتے ہوئے حالات اور لمحے لمحے کے انقلابات نے
لکھنے والوں کو کسی ایک مقام پر جم کر بیٹھے رہنے۔ یا ایک ہی
مرکز کے گرد گھومتے رہنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ حالات
کی چوٹیوں کو پھلانگتے رہے۔ ظاہر ہے۔ ایسے ادوار میں
چکراتی ہوئی زندگی کا اندازہ ایک طائرانہ نگاہ ہی سے
کیا جا سکتا ہے۔ بعض مقامات پر ان عالمگیر سچائیوں کی
صدائے بازگشت بھی کم و بیش آجاتی ہے۔ جو ہر حالت میں
زندگی سماج اور مذہب کے ساتھ چپکی پڑی ہیں۔ اور اس وقت

زمین کی پُر شور دُنیا سے اُبھرتی ہیں۔ جب ماحول میں سکون ہو۔ اور ہمسایہ فضا پر ارتعاش کی بجائے نیند طاری ہو۔ ایسے دَور کے افسانوں میں "کانی" "کاش آپ نے فلسفہ پڑھا ہوتا" "چور" اور "تعاقب" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مجھے سمندر کی کف آلود یا بے پناہ تموّج سے بوکھلائی ہوئی پاگل سطح پر تیرنے میں ذرا بھی لُطف نہیں آتا۔ مَیں اس سطح سے نیچے اُتر کر ایک گہرا غوطہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اِس لئے سمندر کی تہ میں خوبصورت سیپیاں ہیں۔ موتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر اس لئے۔ کہ جو سمندر بظاہر اتنا پُر جوش اور مفید ہے۔ حقیقت میں وہ نیچے سینکڑوں ہاتھ پُر سکون اور پُر امن ہے۔ مجھے طوفانوں کی آغوش میں پلی ہوئی زندگی کی بجائے پُر سکون (normal) زندگی سے عشق ہے۔

لیکن ایک مجبور خواہش اور ایک سنگلاخ حقیقت میں صدیوں کا بعد ہے۔ زندگی میں شکست کا لابدی ہے۔ شکست اور اس سے پیدا ہونے والی آواز اور صدائے بازگشت! عوام کے مقسوم پر ہر ختم مسرّت بھرے قہقہے اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور کی مسلسل اور کبھی نہ ٹوٹنے والی مالا

ہر وقت ٹھنکتی سُنی جا سکتی ہے۔ کبھی اس مالا کے دانے بڑی تیزی سے گرتے ہیں۔ اور کبھی آہستہ! ہر لمحہ اِس میں ایک نئی کڑی کا اِضافہ ہوتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا مسرت کی ایک مُسکراہٹ ہونٹوں پر لانے کے لئے انسان کو کتنے اندوہناک جذبوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

یہاں ایک پیغمبرانہ شان سے کہنا۔ کڑکڑاتے جاڑے کی اس ہولناک رات کے بعد روشن دن طلوع ہوگا۔ خزاں کے بعد بہار آئے گی۔ میرے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے۔ کیونکہ پیغمبر نہیں ہوں۔ اور نہ میں اپنے روزمرّہ کی قید سے نکل کر تخئیل کی ان گھاٹیوں پر آزادانہ گھومتا ہوں۔ جنہیں عناصر سے دُور کی نسبت نہیں۔ مجھے ایسی بعید از قیاس باتیں کرنے سے زیادہ ان لوگوں کی کہانیاں بیان کرنا زیادہ پسند ہے۔ جو میرے قریب رہتے ہیں۔ جنہیں میرے ہاتھ چھُو سکتے ہیں۔ اور جو موجودہ نظام کی دلدل میں بے بس سے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ مَیں مستقبل سے نااُمید نہیں۔ جبکہ میرے یہاں یہ چیتھڑے اور بیہودہ لگا متعفّن نظام اپنے ہاتھوں آپ خودکشی کرتا ہے اپنی

تزئین کے بیر دل کو نگل کر خود بھی موت کے گھاٹ اُتر جاتا ہے۔ اپنے انداز میں یہیں میں پیغمبرانہ شان سے گریز کرتا ہوں۔ دل ہی دل میں ہزاروں منصوبے باندھتا ہوں۔ اور پھر دل، ہی دل ہیں.........

"...... دھڑاب! دھڑاب مکان گر رہے تھے۔ شہر کی اینٹ سے اینٹ بج رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا۔ کہ ہوا میں اُچھلتی ہوئی مٹّی اور ملبے کی گھنی فضا کے پیچھے ایک نیا اور اُجلا شہر تعمیر ہو رہا ہے۔ اس کی نگاہوں میں اشتیاق اُچھل آیا۔ اور وہ اپنی نجات کے جھنڈے کو تھامے طیاروں کو لمحہ بہ لمحہ دُور ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ طیارے جیسے اس کی اپنی آنکھوں سے نکل کر ان اُونچے اُونچے محلّات کی جانب اڑ گئے تھے ...... "
(نئے نظام تک)

پُورے چھ برس جنگ کے شُعلے بھڑکتے رہے۔ آگ اور خُون سے کائنات کا سینہ جُھلس گیا۔ دھرتی کا نرم سینہ جل جل کر پتھر ہو گیا۔ میرے وطن سے فاقہ زدہ، اشتہا سے مرجھائے ہوئے ہاور اُٹھے۔ جمہوریت کے بقا کی خاطر نہیں۔ اور ڈکٹیٹر شپ کی جڑیں اُکھاڑ پھینکنے کے لئے

نہیں۔ بلکہ اپنے پیٹ کی آگ کو بجھانے کی خاطر اِس بڑے جہنّم میں مردانہ وار کُود جانے کو جوق در جوق جاتے رہے۔ جانیں ہتھیلیوں پر رکھے ننّھے ننّھے۔ بلکتے معصوم بچّوں اور خوبصورت نوجوان عورتوں کو داغِ مفارقت دیتے ہوئے اس کی عظمت اور اس کے نام کا جھنڈا گاڑتے ہوئے دُنیا کے کنارے پھاند گئے۔

(۷ مارچ ۴۷ء کو ونسٹن چرچل نے دار العوام میں اپنی زندگی کی معرکتہ الآرا تقریروں میں ایک اور عظیم المرتبت تقریر کا اضافہ کیا۔ تقریر کے دوران میں اپنے کچھ اِس قسم کے خیالات کا اظہار کیا:

ہندوستان کے باشندوں نے اپنی سیاسی پارٹیوں کے برطانوی امپریلزم سے مکمّل مقاطعے کے باوجود اپنے آپ کو ملکِ معظّم اور برطانیۂ عظمیٰ کی عزّت و حُرمت کے سامنے ڈھال بنا دیا۔ اور یہ دُنیا بھر میں سب سے بڑی فوج تھی۔ جو ہم نے کسی ملک سے مجتمع کی۔)

"برطانوی امپریلزم کے بقا کی خاطر لڑنے والے" بچے کھچے بہادر متواتر چھ برس گھروں سے باہر رہنے کے بعد وطن کو لوٹے۔ تو وہی بورڈ ان کے استقبال کو سڑک کے ہر موڑ۔ قہوہ خانے،

اسٹیشن، اور چوک پر اب تک کھڑے تھے۔ جن پر ان دنوں فوجی پروپیگنڈے کا مقصد پورا کرنے کے لئے کچھ اس قسم کے اشتہار تھے، "اچھی تنخواہ، اچھی خوراک اور جلد ترقی۔ مگر اب تو وہاں بُری بھلی تنخواہ، رُوکھی سُوکھی روٹی کا ذکر تک بھی نہ تھا۔ بلکہ اب وہاں ایک نفرت انگیز معذرت درج تھی ؛

ذخیرہ اندوزی بند کرو ؛

قحط کو روکنے کے لئے کم سے کم خوراک کا استعمال کرو ؛

بلیک مارکیٹ کا تدارک کیجئے ؛

کال کی روک تھام انسانیت کا دھرم ہے ؛

پھر وہی کال..... وہی بھوک.... وہی آگ.....

گھور..... گھور..... بمبار طیاروں کی ہولناک آوازیں۔ کیا مستقبل کے گنبد میں گونجتی ہوئی یہ آوازیں ایک تیسری خوفناک جنگ کی نہیں۔ پھر ایک چوتھی۔ حتیٰ کہ اس فرسودہ نظام زندگی کے فلک بوس محلات راکھ اور مٹی کے ڈھیر بن جائیں ؛

"سگنل گرتا ہے"۔ ایک نوجوان کلرک کی خشک اور بے برگ و بار زندگی کے پس منظر پر رومانیت کی چند لکیریں ہیں ۔ وہ رومان جو ایک بار اور صرف ایک بار اس کی زندگی میں آیا۔

مگر کتنا نامکمّل۔ اور تشنہ رومان تھا وہ۔ جس نے رشید کو سرتاپا پیاس بنا دیا۔ ایک پُر ہول خلا۔ وہ بار بار اسی رومان کا اعادہ کرتا ہے۔ بار بار تجدید کرکے اپنے کھوکھلے دلوں میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس پیاس کی تکمیل کے لئے اپنی تشنہ کام رُوح کو سیراب کرنے کے لئے۔ سگنل دھک سے گرتا ہے۔ اس کی ہزاروں اور لاکھوں امنگیں اشارہ پاکر متحرک ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایک دن زندگی کے ٹھوس حقایق اس کے جذبات کا رستہ روک لیتے ہیں۔......

رشید کو محسوس ہُوا۔ گاڑی سگنل سے پرے رُکی کھڑی ہے۔ سگنل ہے۔ کہ اپنی تپسیا میں اس کا ہاتھ ایک جگہ جم کر رہ گیا ہے۔ اور اب فولاد کی دو متوازی پٹڑیاں جو یارڈ کی بے شمار لائنوں میں نمایاں ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے المناک حد تک سُنسان رہیں گی۔ اور سگنل کا بازو اسی طرح اکڑا رہے گا۔ (سگنل گرتا ہے)

۲۶ اگست ۱۹۴۶ء بارہ مولے (کشمیر) بیٹھ کر میں نے ایک المیہ خط لکھا تھا۔ جنّت کے آنسو! کا کردار نام مقام کے لحاظ سے قریب قریب وہی ہے جس سے مجھے جنّت کشمیر کے

کیساروں میں، سیب، ناشپاتی، اور آلو بخارے کے باغات میں دوچار ہونے کا اتفاق ہؤا۔ وہ دن بھر مکّی اور دھان کے کھیتوں میں اپنی ایک بکری اور اس کے چھوٹے سے بچّے کو ساتھ لئے بھاگتی پھرتی۔ اور اس وقت مجھے ایک خوشگوار مگر بہت تیز ہوا کے چلنے کا احساس ہوتا۔

انور کہنے لگا "یہ ہوا بارہ مولا میں بلاناغہ چلتی ہے۔ مغرب سے مشرق کی جانب۔ جہلم کی مخالف سمت میں۔ اس وقت لہریں زیادہ تُند ہو جاتی ہیں۔ اور ولر میں تو ایسا تباہ کُن تموّج پیدا ہوتا ہے کہ چار بجے کے بعد کوئی ہانجی اِدھر کا رُخ نہیں کرتا۔ (رجنّت کے آنسو)

افسانے میں جگہ جگہ میں نے کوشش کی ہے اپنے ماحول کی سچّی آئینہ دار ہے۔

اب ایک ایسا افسانہ پیش نظر ہے۔ جس کے موضوع میں شاید ایک طرح کا تنوع موجود ہے۔ اُردو ادب میں بہت تھوڑی کہانیاں اب تک ایسی لکھّی گئی ہیں۔ جن میں انسانوں کی بجائے جانوروں کے کردار پیش کئے گئے ہوں۔ اس مجموعے میں کم از کم دو کہانیاں ایسی ہیں۔ جو شاید اسی تشنگی کے

ردِ عمل کے طور پر معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ ان میں "مداخلت" تو سو فی صدی ایک پولٹری فارم (Poultry Farm) کی ٹریجیڈی ہے۔ اور "تعاقب" میں ڈالمیشین نسل کے ایک کُتّے کا رول نہایت اہم ہے، ارشد کے ذہن میں احساسِ جُرم کا ایک کانٹا کھٹکتا ہے وہی چبھن ہے جو اسے تمام عجیب و غریب حرکات پر اُکساتی ہے۔ اور افسانے کو موضوع کے لحاظ سے انوکھا اور امتیازی رنگ دے دیتی ہے +

"مثبت و منفی" میں رضیہ پھر ایک جھلکی ہے۔ وہ کچھ ایسے حالات کی اسیر ہے۔ جہاں جذبات کے اظہار کے لئے اس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہو سکتا وہ اپنی آپا سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ مگر اس محبت کے بیچوں بیچ ایک اختلاف نہ جانے کہاں سے اُبھر آیا۔ محبت بدستور قائم رہی اور اختلاف بھی +

...... اور کبھی کُودتی پھلانگتی ان چٹانوں کی طرف چلی جاتی۔ جو دو پتوں کی مانند ساتھ ساتھ کھڑی ایک دوسری پر جُھک رہی تھیں۔ ان کے بیچوں بیچ بھاگنے والے تنگ رستے پر کھڑے ہو کر اسے بڑا ڈر لگتا۔ وہ سوچتی۔ یہ دو بہنیں

ہیں۔ مگر ان کی زندگی میں کس قدر بعد ہے، ان میں اختلاف ہے۔ ان کے بیچوں بیچ بھاگنے والا تنگ رستہ! یہی وہ اختلاف ہے جو انہیں قیامت تک ایک نہیں ہونے دیگا۔ .... دو بہنیں! لیکن اس وقت اسے یُوں محسوس ہُوا کہ وہ چٹانیں۔ اس کے جذبات کی دو متضاد کیفیتیں ہیں۔ جن کی آہنی گرفت اس پر موت بن کر چھا رہی ہے +

(مثبت و منفی)

"اتوار کی ایک شام"۔ اُردو لباس میں لانے سے پہلے میں نے اسے (.Sunday Eve) کے عنوان سے انگریزی زبان میں لکھا تھا۔ جس میں نام مقام سب مغربی تھے۔ اس کی موجودہ صورت میں مرکزی کردار ڈیڑھ پچاس پچپن برس کی بُوڑھی عورت کرم نشاں ہے۔ جو اپنے معصوم ننھے ننھے پوتے سے بے حد متاثر ہے۔ وہ اس کی مَوت کے ساتھ اپنی زندگی سے ہاتھ تو دھو سکتی ہے۔ مگر قصبے کی عورتوں میں اِس امر کا اظہار کرنا اِس کے بس کی بات نہیں۔ کہ اس کا ننھا پوتا۔ جس کی تعریفوں کے پُل باندھتے آج تک اس کی زبان نہیں تھکی۔ اسے بھوت سمجھتا ہے۔ اور اس کی صُورت دیکھتے ہی چیخیں مار۔ مار کر

رہ جاتا ہے۔

کہانی "اسی فردوس میں" ایک مزاحیہ واقعہ کے عنوان سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ مگر اس مزاح میں کے نقوش کتنے گہرے اور عمیق ہیں۔ رشید اور ثاقب کے کردار۔ ان کے آپس میں ٹکراؤ، اور انفرادی حیثیتوں میں ان کی زندگیوں کے رُک رُک کر چلتے ہوئے لمحے، خود فریبی کی حسرت آمیز سعی و عمل، ان سے ہمدردی پیدا کرتے ہیں۔ کیا ایک مزاحیہ کہانی تلخ ترین المیہ (Grave Tragedy) نہیں بن جاتی۔

"نئے نظام تک" کے بعد "گرفت" میں سماج کا ایک اور ناسور دیبائے حریر کے منقش پردوں سے نکل کر منظر عام پہ آتا ہے۔ یہ درست ہے۔ کہ معصوم اور غریب دیہاتیوں کی زندگی بہت دردناک اور اذیّت کیش ہے۔ پولیس سے لے کر پٹواری تک ان کی کھال ادھیڑنے میں مصروف ہیں۔ جتنی عزّت و حُرمت سے پٹواری کو گاؤں میں دیکھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ نفرت دیہاتیوں کے دل میں اس کے لئے جاگزیں ہوتی ہے۔ مگر کیا رشوت خوری کی عادات

رکے لئے سو فیصدی پٹواری کو موردِ الزام گھبرایا جا سکتا ہے۔ رفیق اس سلسلے میں ہر اس پٹواری کی نمایندگی کرتا ہے۔ جس کے اندر انسان سویا ہوُا نہیں جاگ رہا ہے۔ پٹواری سات آٹھ دیہات کا حاکم ہوتا ہے۔ اور اس حاکم کو حکومت کی طرف سے جو مشاہرہ ملتا ہے:

"...... اِس کی دن رات کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور بیس روپے تنخواہ جمع سات روپے قحط الاؤنس۔ دُنیا کا سب سے بڑا کلرک! حکومت کی مشینری کا دار و مدار۔ قلم کی جُنبش ایک محدود نظام کو تباہ کر دینے والا ایجنٹ اور یہ تنخواہ" اِس نے ایک لمحہ کے لئے سوچا۔ اسے ٹُوٹا جا رہا ہے۔ اور ٹُوٹنے پر مجبور کیا جا رہا ہے" (گرنٹ)

جس شخص کے دبدبے، قلم، اور کاغذات کا سایہ دیہات کی چپہ چپہ زمین پر لہرا رہا ہو۔ اسے بدحالی کے اِس دَور میں ستائیس روپوں کی تھپکی دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ وہ اپنی ساکھ قائم رکھنے۔ اپنی ظاہر داری میں یکسانیت برقرار رکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرے گا۔ بہتے پانی کے سامنے ایک رکاوٹ ہو۔ تو اس کے بہاؤ کے سینکڑوں رستے

رستے آپ سے آپ بن جاتے ہیں۔ کون اِس کی مظلومیّت پر شک کر سکتا ہے۔ رفیق اپنی رُوح کے روشن پہلو سے متاثر ہو کر عہد باندھتا ہے۔ کہ اب وہ دوبارہ عمرو کی ہڈّیوں میں اپنے زہریلے ناخن نہیں بھونکے گا۔ لیکن یہ عہد باندھتے وقت وہ اپنے چاروں جانب بنے ہوئے اِس حال کو بھُول جاتا ہے۔ جس کے سخت اور بیرحم دھاگوں میں اس کا بال بال بندھا ہُوا تھا۔

"چور" ایک تساہل پسند، محض سوچ ہی سوچ میں سب کچھ کر گزرنے والے نوجوان کی کہانی ہے۔ ایسی حماقتیں انسان دن میں کتنی مرتبہ کرتا ہے۔ اس نے ایک کام نہیں کیا ہوتا۔ مگر مطمئن ہوتا ہے۔ کہ اِس کام کو وہ سرانجام دے چُکا ہے۔

شاید یہ ٹالسٹائی ہی تھا۔ جس نے عورت کو عُقدہ لاینحل تسلیم کرتے ہوئے کیا کہا تھا۔ کہ عورت ایک ایسا ہولناک راز ہے۔ جسے میں صرف اسی وقت فارغ کروں گا۔ جب میرا ایک پیر قبر میں ہو گا۔ اور دُوسرا دُنیا میں۔ کافی جہاں نجمہ کے لئے ایک واضح علامت ہے وہاں جواد جیسے

کردار کے لئے بھی ایک اشارہ ہے۔ کافی کا اثر اس کی زندگی میں کتنا گہرا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ضمیر ہی کافی سے اُٹھایا گیا ہے۔ وہ نجمہ سے محبت کرتا ہے۔ اس سے نفرت کرتا ہے۔ غیرت مند ہے۔ بے غیرت ہے۔ اور اس کہانی میں راوی کا اپنا کردار! افسانے کی ساری ہی کافی تو مسلط نہیں ہے کہیں +

"چپت"۔ اور یہ وہ چپت نہیں ہے کیا؟ جو ایک ناکردہ گناہ کے الزام میں معصوم جوان کے چہرے پر پڑی۔ اور اُنگلیوں کے نشان وہیں مرتسم کر گئی۔ جس کی جلن اور موجودگی کا احساس اس وقت یکلخت اُبھر کر تیکھا ہو گیا۔ جب اسے انتقام کا موقعہ ملا۔ اس کے پیٹ کی آگ، اپنی مقدس ماں کے رُوبرو باندھے ہوئے عہد اور اپنے تاریک مستقبل کے تلخ احساسات ایک دم اس کے دل و دماغ سے محو ہو گئے۔ اور اس نے ..... دھڑ..... دھڑ دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ تاکہ اُونچے ایوانوں میں کھیلے جانے والے گھناؤنے ڈراموں کا راز آشکار کر کے اپنی بے داغ جوانی کے چہرے سے چپت کی سوزش کم کر سکے +

"کاش آپ نے فلسفہ پڑھا ہوتا"۔ پھر ایک دلکش کہانی ہے۔ جہاں سرشور جوانیوں کے قہقہے اور حُسن ملیح کی دلفریب جھلکیاں ہیں لیکن یکایک اس مٹھاس کے جگر سے تلخی کی ایک لکیر اُبھرتی ہے۔ اور اُبھرتی چلی جاتی ہے +

"کھڑکی"۔ اس افسانے میں بانو کی شخصیت غور طلب ہے۔ وہ گوشت پوست کی بنی ہوئی عورت ہماری زندگی اور سماج میں قدم قدم پر ملتی ہے۔ اسے ہر مقام پر پہچاننے کیلئے صرف حافظے پر ذرا دباؤ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ پیچیدہ راہوں کے ہر موڑ پر اس کا ہیولہ ایک نئے ملبوس میں ایستادہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ بعض لوگ اسے سطحی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور بعض قدم آہستہ کر لیتے ہیں۔ دو ایک لمحے اس کے قریب رُک بھی جائیں تو اسے تضیع اوقات نہیں سمجھتے ۔ بانو! میں بہت سی کمزوریاں۔ اور بعض اچھی باتیں بھی کافی مقدار میں ملتی ہیں۔ وہ اس خطرناک حقیقت سے کبھی چشم پوشی نہیں کرتی۔ کہ وہ ایک عورت ہے۔ لیکن اس کی زندگی میں ایک سانحہ ایسا آیا۔ جب وہ بلندیوں سے پستیوں کی مرگ آسا وسعتوں میں اُتر پڑی۔ مگر یکلخت ایک ڈھلوان پر ساکت ہو گئی۔ پتھرا گئی۔ اور یہ سب اسوقت ہوا۔ جب اپنے شوہر کے تفویض کردہ تاریک زنداں میں ایک کھڑکی آپ سے آپ کھل گئی۔

اور اسکے دل کی فضا باہر کی روشنی سے چند لمحوں کے لئے جگمگا اُٹھی۔ اسوقت وہ چوٹ بھی اسے کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ جس کے پار وہ تو سب کچھ دیکھ لیتی ہے۔ مگر باہر سے کوئی اندر نہیں جھانک سکتا۔ اور یہ اس کی مادرانہ شفقت سے اُبھرا ہوا ایک ہولناک جذبہ ہے۔ جو گھٹا گھٹا ماحول پاکر بوکھلا گیا۔ اسکے گھر میں ٹھہرے ہوئے مستقل مہمان (Paying Guest) اِس جذبے کو اپنی عجیب و غریب فتوحات کے تازیانوں سے اُبھارتے چلے جاتے ہیں۔ یہانتک کہ ایک دن وہ کھڑکی سے گرتے گرتے بچی ہے۔

اور یہ ہیں۔ میری کاوشوں کے متعلّق میرے اپنے خیالات ؛

"جنّت کے آنسو" کے متعلّق جو آرا میرے نقاد قائم کرینگے۔ ہو سکتا ہے وہ میرے لئے قطعی طور پر حیران ہوں۔ لیکن اگر اس سلسلے میں خلوص سے کچھ بھی کہہ دیا گیا۔ مجھے کڑی سے کڑی تنقید کا شکار بھی بنا دیا گیا۔ تو میں خاموشی اور ٹھنڈے دل سے اِس کی تلخی کو سہ لونگا۔ اور ان دلائل کی روشنی میں اپنے لئے کوئی صحیح اور واضح راستہ بنانے کی پوری کوشش کروں گا ؛

ظہور ملک
گجرات

سگنل گرتا ہے

رشید بدستور پلیٹ فارم پر لمبی لمبی قلانچیں بھرتا رہا۔ اور بار بار دیکھے ہوئے چہروں میں کسی حسین افسانے کی جستجو میں محو رہا۔ مسافروں کی جمی ہوئی نشستیں گاڑی کی آمد آمد سے اُکھڑ چکی تھیں اور قلیوں کی سُرخ فوج ایک صف میں بیٹھ گئی۔ اس نے دُور سے لائن کو یارڈ میں گم ہوتے ہوئے دیکھا! گاڑی کوئلے کے سیاہ اور کثیف دھوئیں کے ساتھ بھاپ کی ایک تیز بوچھاڑ اگل رہی تھی۔ جیسے سفید مٹیالے سفوف کی پچکاری آسمان کی جانب چلائی جا رہی ہو۔ گاڑی دُور سے ایک مقام پر ساکن نظر آ رہی تھی اور اب بھاپ کی سپید مٹیالی پچکاری چھوٹنی بند ہو چکی تھی۔ اس نے ایک دو لمحوں کے وقفے کے بعد گاڑی کی چیخ سُنی۔ اور سوچنے لگا روشنی اور آواز دو ساتھی ہیں۔ روشنی برق رفتاری سے آن کی آن میں

منزل پر جا پہنچتی ہے آواز گھسٹتی رہتی ہے۔ زندگی کی شاہراہ پر لنگڑاتی ہوئی چلتی ہے ۔

مسافر پلیٹ فارم پر بچھی ہوئی بنچوں کو خالی کر رہے تھے۔ ایک ہلچل تھی۔ ایک بے چینی، جو ہر مسافر کی طبیعت میں پیدا ہو کر اسے اوچھی حرکات پر اکسا رہی تھی ۔

گاڑی جس تیزی سے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اس سے رشید کو ایک بار پھر ان شعاعوں کا علم ہوا جو ہمیشہ سے عکس معکوس کے دلچسپ جھمیلے میں گرفتار رہیں۔ وہ شعاعیں کہیں اپنا مقام نہیں بنا سکتیں سرگرم رہتی ہیں۔ سطحوں سے ٹکراتی، فضا کو چیرتی، کسی نامعلوم منزل کو رواں رہتی ہیں ۔

یہ گاڑی! یہ ساڑھے گیارہ بجے کی گاڑی! کیا پلیٹ فارم پر سے اس کی نگاہوں کو منتظر چھوڑ کر آگے نکل جائے گی؟ لیکن گاڑی رُک گئی اور وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں گاڑی کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک بھاگ کر آنے جانے لگا۔ تھوڑی دیر میں اسے احساس ہُوا کہ گاڑی یہاں نصف گھنٹے سے بھی زیادہ وقفے کے لئے ٹھہرے گی ا سے کیوں اتنی پریشانی ہو رہی ہے ؟ اس نے ایک لمحہ کے لئے

رُک کر حواس درست کئے۔ اور پھر زنانہ ڈبّوں کے قریب جاکر چہروں پر بار بار مگر پھُرتی سے نگاہیں دَوڑانے لگا۔ اس کے سارے جسم پر پسینے کے قطرے بہہ نکلے تھے۔ اسٹیشن کی بھیڑ بھاڑ۔ نووارد اور انجان مسافر، قُلیوں کی ریل پیل، سامان سے لدے ہوئے ٹھیلوں کی دگڑ دگڑ +

اس نے دو ایک نگاہوں کو اپنی حرکات کا جائزہ لیتے ہوئے محسوس کیا۔ اور سوچنے لگا۔ شائد اِس ٹرین میں اس کی کوئی رشتہ دار ہے جو امرتسر جا رہی ہے۔ وہ اسے ملنا چاہتا ہے ممکن ہے وہ رشتہ دار لڑکی، اسے کوئی نئی بات بتا سکے۔ اپنے گھر کے متعلّق۔ اپنی نئی شادی اور نئے نئے تاثرات کے متعلّق۔ پھر یہ بھی ممکن ہے اسے یہ کہے۔ کہ مجھے۔ کلرکی بالکل ناپسند ہے۔ جس کی بڑی وجہ میرا جابر اور خشک طبع سب ہیڈ ہے جو میری ایک ایک حرکت پر کڑی نظر رکھتا ہے اور جب ساڑھے گیارہ بجتے ہیں۔ اِس گاڑی کی آمد کا وقت ہوتا ہے تو دفتر سے نکل آنے میں وہی سب سے بڑی روک ثابت ہوتا ہے لیکن یہ ٹرین! جس میں تمہاری آمد متوقع ہوتی ہے اس کا سگنل گرتا ہے تو اس وقت میں ایک

معمولی کلرک نہیں۔ بلکہ دُنیا کا سب سے بڑا باغی اور سرکش انسان ہوتا ہوں۔ میں ساٹھ روپے کی حقیر رقم کے عوض اپنے جذبات کے تقدّس کو آگ لگا دینے میں معذوری کا اظہار کرتا ہُوں اور گاڑی کے اسٹیشن میں داخل ہونے سے بہت پہلے پلیٹ فارم پر پہنچ جاتا ہوں۔ رشید سوچنے لگا ممکن ہے میں اس سے یہ بھی کہہ سکوں۔ کہ اگر تمہاری شادی دلّی میں نہ ہو جاتی۔ تو میں کلرکی کسی قیمت پر بھی اختیار نہ کرتا۔ کاشتکاری کے متعلّق سوچتا۔ تجارت اور صنعت میں ترقّی کی راہیں کھُلی تھیں۔ میں لکھ سکتا ہوں تصنیف و تالیف اپنا شعار بنا لیتا۔ لکھنا و کھنا تو اب دل کے پھپھولے پھوڑنے کے برابر ہے مگر خیر ان باتوں میں کیا دھرا ہے گاڑی دلّی کے لئے روانہ ہونے والی ہے ممکن ہے پھر ملاقات ہو نہ ہو۔ کچھ دلّی اور اپنے شوہر کے متعلّق کہو شائد تم اس کے پاس رہ کر خوش نہیں معاف کرنا میرا مطلب یہ نہ تھا کہ تمہارا دل دُکھے بہتر یہی ہے کہ تم اپنے شریر النفس شوہر کو اپنی محبّت کا یقین دلائے رکھو اور اسے پل بھر کے لئے بھی محسوس نہ ہونے دو کہ تمہارے دل میں اس کے علاوہ کوئی اور شخص راج کر رہا ہے۔

اِس طرح گرہستی تباہ ہو جاتی ہے مجھے پھر افسوس کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے کہ مَیں ایسی باتیں کیوں کرتا ہوں؟ جن سے تمہیں دلی تکلیف ہوتی ہے۔ ہاں! روشنی آواز کی ساتھی! آواز کو تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ کر زمین و آسمان کی مختلف سطحوں کے درمیان تھرّا رہی ہے مَیں اسے انتظار بھری نگاہوں سے تک رہا ہوں اِس آواز کی مانند جو اپنی زندگی سے دستبردار ہو کر تھرا گئی ہو ؛

دو مہینے ہوتے ہیں نہیں شائد تین مہینے۔ تم اس دن بھی دلّی جا رہی تھیں۔ میرا خیال تھا تم اِس گاڑی پر آؤ گی جو یہاں ڈیڑھ بجے پہنچتی ہے۔ خیال تھا اور خیال اکثر غلط ہوتے ہیں۔ میں نے ڈیڑھ بجے کی گاڑی دیکھی، بلکہ کونا کونا چھان مارا۔ مگر ناکامی ہوئی میں نے تمہاری ملاقات کی جو جنّت تعمیر کر رکھی تھی۔ بہت جلد مسمار ہو گئی ؛

مَیں نہیں کہہ سکتا۔ اِس کے بعد مجھے کس نے بتایا؟ کہ تم اسی دن ساڑھے گیارہ بجے کی گاڑی سے دلّی پہنچ چکی تھیں۔ لیکن میرے لئے اِس حقیقت کو تسلیم کرنا کس قدر دشوار تھا۔ بادلِ ناخواستہ یہ سوچ کر دل کو تسکین دی کہ تم

آج گاڑی میں سوار ہونے سے رہ گئیں۔

اور آج اس واقعہ کو دو مہینے ہوتے ہیں۔ نہیں شائد تین مہینے میں ہر روز ساڑھے نبجے کی گاڑی دیکھنے یہاں چلا آتا ہوں سب ہیڈ ڈ بیچنتا ہے چلّاتا ہے لیکن ۔۔۔۔۔

رشید تیزی سے ایک بار سامان سے لدے ہوئے ایک قُلی سے ٹکرایا۔ سامان گرتے گرتے بچا۔ سامان کی مالکہ نے دو چار کڑوے کسیلے انگریزی الفاظ سے اس بوکھلائے ہوئے نوجوان کی تواضع کی۔ اور بکتی جھکتی پُل پار کرنے کے لئے سیڑھیاں طے کرنے لگی۔

رشید کے گھٹنے پر چوٹ آئی تھی۔ مگر اسے اس چوٹ کی بجائے اپنے تخیئلی طلسم کی شکست کا زیادہ احساس ہوا۔ وہ کچھ دُور تک گھسٹتا ہوا چلا گیا۔ اور جب درد کا احساس کافور ہوا تو اسے اپنی جستجو میں ناکامی کا خیال آیا، مستورات میں سے کوئی چہرہ بھی ایسا نہ تھا جسے اس نے اپنی زندگی میں کبھی دیکھا ہو۔ تاہم یہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی ایسا ہر روز ہوتا تھا۔ ہر روز ساڑھے گیارہ بجے جب وہ دفتر کی کھڑکی سے دلّی جانے والی گاڑی کے سگنل کو گرتے ہوئے دیکھتا

ایسا ہر روز ہوتا۔ کہ اسے گاڑی میں بیٹھی ہوئی ان گنت مخلوق میں کوئی صورت بھی آشنا معلوم نہ ہوتی۔ اکثر ڈبوں میں تانک جھانک کرتے ہوئے اس نے کسی پیاسی عورت کی استدعا پر اسے پانی پلانے کا شرف حاصل کر لیا ہو۔ تو وہ علیحدہ بات ہے۔ لیکن وہ رومان جنہیں اس کا ذہن اختراع کر چکا تھا یا اس کے دوست چٹخارے لے لے کر بیان کرتے رہے تھے۔ اس کی نظر اور تجربے سے ابھی تک نہیں گزرے تھے۔ البتہ وہ دن اسے خوب یاد تھے جب چند ایک عُمر رسیدہ عورتوں نے اسے تاک جھانک کی پاداش میں بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

اِس نے پلیٹ فارم کے کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ گاڑی پانچ سات منٹ تک چلنے والی تھی۔ گارڈ ریفرشمنٹ روم سے نکل کر مختلف اندازِ نظر سے ریل کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور پھر جلد ہی روانگی کی گھنٹی بجی اس کے اعضا میں بے چینی کروٹیں لینے لگی۔ اس نے ایک ایک کر کے سب ڈبے چھان مارے ایک آخری کوشش کا عزم استوار کرتے ہی وہ پھر زنانہ ڈبوں کی طرف چل دیا۔

وہ لڑکی جو ابھی ابھی اس کھڑکی کے قریب آ کر بیٹھی تھی۔

وہ بھی اِن سینکڑوں مسافر عورتوں میں سے ایک تھی۔ جن سے رشید قطعی طور پر نا آشنا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ امرتسر جائے گی یا کسی اَور مقام پر اور نہ وہ اس کے شادی شدہ ہونے پر کسی قطعی رائے کا اظہار کر سکتا تھا لیکن اس کی نشست کے آفاقی انداز سے مرعوب ہو کر سوچنے لگا کہ یہ نشست دلّی جاتی ہوئی اس کی کسی رشتہ دار لڑکی کے لئے کس قدر موزوں ہے ؛

وہ بڑھ کر اس لڑکی سے پُوچھنا چاہتا تھا۔ تُم کہاں جاؤ گی؟ دلّی! یا کسی اَور بڑے شہر! کیا تم بھی اپنے پیچھے کسی آواز کو گھٹتا چھوڑ کر آسمان و زمین کی پہنائیوں میں تھرّانے جا رہی ہو تم کونسی چمکیلی سطح سے ٹکرا کر اب ایک نئی منزل کو بڑھ رہی ہو؟ وہ آواز جو چند سکنڈ سے زیادہ تمہاری ہمراہی کا شرف حاصل نہ کر سکی۔ وہ فضا کے اِس لامحدود پھیلاؤ میں کہاں منجمد پڑی ہے ؛

گاڑی نے ایک تیز سیٹی سے روانگی کا اعلان کیا۔ رشید کی آنکھوں کے سامنے سے تمام پردے سرک گئے اب ایک آخری پردہ اس کے روبرو تھا۔ جہاں کرنیں تھرک رہی

تھیں۔ اور ان کے پس منظر میں رخصت ہوتی ہوئی گاڑی کا ایک موہوم اور تکلیف دہ نقش اُبھر آیا تھا۔

خالی خالی پلیٹ فارم اسے کھٹکنے لگا اِس نے بہت جلد ذہنی تفکّرات کو اپنے دفتر کی غیر حاضری کے خیال میں سمو دیا اور وہ سب ہیڈ کے اذیّت بخش سوالات کے لئے بہانے تلاش کرنے لگا پھر یکایک اسے اپنی حماقت کا احساس ہُوا، آخر وہ کیوں اپنی ملازمت کا ریکارڈ خراب کر رہا ہے، ساڑھے گیارہ کی گاڑی دیکھ لینے کی خواہش اس پر جنون بن کر طاری ہو چکی ہے آخر کیوں؟ یہ سب کس لئے؟ دفتر تک پہنچتے پہنچتے اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ اور اس نے ایک آخری فیصلہ کیا۔ کہ وہ ایک اچھّی زندگی بسر کرنے کے لئے اپنی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالے گا ہر قیمت اور ہر ممکن طریق پر۔

اور اس کا ارادہ پُختہ رہا رات بھر میں اس نے اپنے فیصلے کو احترام کی نظر سے دیکھنا سیکھ لیا تھا۔ دُوسرے دن صبح وہ دفتر پہنچا تو ایک بے نام سی مسرّت اس کے رگ و ریشے میں رچ گئی تھی۔ اسے اپنا مستقبل سہانا دکھائی دے رہا تھا، اس نے سب ہیڈ سے معذرت کر لی۔ کہ وہ آیندہ اس کے

احکام پر پُوری پُوری توجہ صرف کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور جس وقت اس نے کُرسی میں بیٹھ کر میز کی دراز کھولی۔ تو اسے یونہی خیال سا آیا کہ کھڑکی کے اس پار سگنل کو دیکھے جو ہر روز ساڑھے گیارہ بجے اسے گاڑی کی آمد کا اعلان سُناتا ہے۔ اس کی رُوح میں ٹھہراؤ کی سی کیفیّت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر یکایک اسے محسُوس ہُوا۔ جیسے وہ کسی بلندی پر سے گرنے سے پہلے چٹان کی ایک یکلخت ڈھلوان پر ساکت ہو چلا ہو۔ یا اس کی زندگی کسی دوراہے پر ششدر کھڑی تھی۔ سگنل کا بازو اکڑا ہُوا تھا۔۔۔ رشید کو محسوس ہُوا۔ گاڑی سگنل سے پرے رُکی کھڑی ہے۔ سگنل ہے کہ اپنی کڑی تپسیا میں اس کا ہاتھ ایک جگہ جم کر رہ گیا ہے۔ اور اب فولاد کی وہ دو متوازی پٹڑیاں جو یارڈ کی بےشمار لائنوں میں نمایاں ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے المناک حد تک سنسان رہیں گی۔ اور سگنل کا بازو۔ اسی طرح اکڑا رہے گا ⁂

اسی وقت کلاک نے گیارہ بجائے۔ رشید کو اختلاج ہُوا۔ اور سب ہیڈ پھر چلّایا ⁂

مسٹر رشید! آج بھی اگر آپ رخصت لئے بغیر دفتر سے چلے گئے تو اس کے لئے آپ کو جوابدہ ہونا پڑے گا! سُنتے

ہیں آپ!"

رشید نے سُن لیا تھا۔ مگر وہ بولا نہیں۔ کھڑکی کے پار بہار کی چمکیلی دھوپ میں اس کے سنہرے احساسات کا ایک لطیف ہیولیٰ رقص کر رہا تھا۔ گا رہا تھا۔ ناچ رہا تھا۔ ہوا کے تموّج پر کچھ رُکی رُکی لہریں تیر رہی تھیں احساسات کے اس سنہرے ہیولیٰ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اس نے سوچا۔ سگنل تھوڑی ہی دیر میں اپنا بازُو دھک سے نیچے گرا دے گا۔ اور پھر ——————؟

پانچ منٹ اور گزر چکے تھے۔ اس دن کا کام جُوں کا تُوں میز پر رکھا تھا۔ اور رشید اپنے ہولڈر کی ریلیف نب سے دوات میں سیاہی گھول رہا تھا۔

رشید کا دل دھڑکنے لگا۔ دفتر کے کلاک کے مدقوق سانس اس کے حلق میں گھنگرو بجا رہے تھے۔

"مسٹر رشید!" اس کے ساتھی کے لہجے میں شفقت تھی۔ اور رازداری کا احساس دلا دینے والا تیر بہدف انداز۔!

"یہ کمبخت سب ہیڈ ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑا ہے دفتر سے بھاگ نکلنے کی بجائے دلجمعی سے کام کرو۔ ورنہ

دیکھ رہے تم اس کے تیور!"

رشید کے جسم میں سوچ کی خنکی نے جھرجھری پیدا کردی اس نے بڑے اطمینان سے قلم لیا اور ناخن پر دبا کر اس کی جانب دیکھنے لگا ــــــ اسے گھڑی کی طرف نظر اُٹھاتے ہوئے خوف محسوس ہونے لگا۔ سوئیاں بھاگ رہی تھیں۔ اور وہ ارادہ کرچکا تھا کہ وہ دل لگا کر دفتر کا کام کرے گا۔ تاکہ آئندہ سال کچھ ترقّی کی اُمید رکھ سکے اور افسرانِ بالا سے اپنے متعلق ایک اچھّی رپورٹ لکھوا سکے۔ وہ گھڑی کو ساڑھے گیارہ بجاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے گا۔ کھڑکی کے اس پار سگنل کا بازو ایک ہی مقام پر جم چکا تھا ــــــ اس کا قلم بڑی تیزی سے چلنے لگا۔ اور وہ خوش تھا۔ کہ باوجود ایک انتہائی قسم کی خواہش کے اس نے ابھی تک وقت نہیں دیکھا تھا۔ اور اب اس کا ہاتھ تھک چلا تو آزادی کے ساتھ ایک بھرپور انگڑائی لی۔ قلم میز پر ٹیک کر وہ اپنے ساتھی سے کہنا چاہتا تھا۔ آج میں بہت خوش ہوں مجھے پروا نہیں کوئی دلّی جائے یا جہنّم میں۔ آج میں بہت ...... ناگاہ اس کی نگاہیں کھڑکی کے

اِس پار سگنل کے کھمبے پر پڑیں سگنل بہار کی چمکیلی دھوپ میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ حیران ہوا کیا اس کی دُعا بیکار گئی۔ رشید اپنے کام میں مشغول تھا۔ سگنل نہ جانے کب سے گر چکا تھا۔ اس کی زندگی میں ایک غیر معمولی ساعت کی آمد کا نقارہ بج چکا تھا۔ اور وہ بے خبر تھا۔ کلاک نے ٹن سے ساڑھے گیارہ بجائے، اس کی رگ رگ میں ایک کھچاوٹ اور سختی نمودار ہوئی رشید ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی نشست سے اُٹھا "کیا بات ہے؟" اِس کا ساتھی چونک پڑا "یہ کیا ہو رہا ہے؟" سب ہیڈ اس کی بارتمیزی پر بل کھانے لگا۔ رشید ہوا کے تیز جھونکے کی مانند سب ہیڈ کے قریب سے گزر گیا۔ اور بڑے گیٹ میں سے ہوتا ہُوا لوہے کے جنگلے کی طرف بڑھ گیا۔ جس کے پار یارڈ میں آڑی ترچھی لائنوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے کی گاڑی زور شور سے سگنل کے قریب سے گزر کر اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔

جنّت کے آنسو

جلے ہوئے پٹرول کے دھوئیں سے بس کی اندرونی فضا گھٹی گھٹی سی تھی۔ سڑک پر قدم رکھا۔ تو ہوا کا پہلا جھونکا چہرے سے ٹکرا کر رُوح کی عمیق ترین گہرائیوں میں اُترتا ہُوا معلوم ہُوا۔ سُورج مغربی پہاڑوں کے اِدھر غرُوب ہو چکا تھا۔ اور تحصیل کی بے رنگ عمارت سے پرے بلند سفیدے ہوا کے تیز بہاؤ میں شور مچا رہے تھے۔

ایک نوجوان کشمیری میرے قریب آ کر چُپ چاپ کھڑا ہو گیا اُس کی پوشاک مقابلتاً صاف تھی۔ مگر اُس کے انداز اور خاموش آنکھوں کے اطوار سے متاثر ہو کر میں نے بے ساختگی سے پُوچھ لیا "سامان اُٹھاؤ گے؟" میرے الفاظ سُنتے ہی اُس نے گلے میں لٹکی ہوئی سُوت کی رسّی کھینچ لی۔ اور سامان باندھنے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے کنکھیوں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ وہ کنکھیوں سے ایک لڑکی کی طرف دیکھنے میں مصروف تھا۔

اگر اس خط کے واقعات اور اُن کی ترتیب کو تم ایک کہانی کا نام دے سکو۔ تو تمہیں یہ جان کر تعجّب ہوگا۔ کہ وُہی لڑکی اِس کہانی کی محرّک ہے۔ اِس افسانے کی رُوحِ رواں اور ایک المیہ کردار ـــــــ آج کشمیر آئے مجھے دو ہفتے ہوتے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے بھی کہیں آرام سے ٹکنے کا موقعہ نہیں ملا۔ چار پانچ دن سری نگر کی سیاحت میں صرف کر دیئے۔ پھر سوپور چلا گیا۔ ولر کے نظاروں میں کھو کر اشمی کی المیہ زندگی کو بھول جانے کی کوشش کی۔ گُل مرگ سے پرے کھلن مرگ اور الپتھر دیکھتا ہُوا پھر بارہ مولے پہنچ چکا ہوں۔ مگر ایک کرید ہے۔ ایک خلش۔ جسے اس لڑکی نے میرے ذہن میں ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے۔ مَیں ابھی تک اس کے معصوم چہرے سے لپٹے ہوئے اُس بر اس کو محسُوس کرتا ہوں۔ جو بارہ مولے کی ایک شام کو میری آنکھوں نے دیکھ پایا تھا۔

ـــــــ "تمہارا نام کیا ہے؟" اپنے قُلی سے مخاطب ہوتے

ہوئے میں نے کہا :

"عزیزہ! صاحب!"

"عزیزہ! تم بہت اچھا آدمی ہے"۔

مَیں دراصل اس کی جسمانی صفائی اور طبیعت کی نفاست کو سراہنا چاہتا تھا ۔

"ہاں صاب! ام ذرا اچ کپڑا اُٹھاتا ہے نا۔ صاب لوگ بُوت پسند کرتا ہے"۔

عزیزہ سامان باندھ کر حکم کا منتظر تھا۔ مَیں اپنے ساتھی کی طرف متوجّہ ہُوا ۔

اِس کا نام انور تھا۔ راولپنڈی سے نکلتے وقت ہم ایک دُوسرے سے بات کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مری کی پہاڑیوں میں داخل ہوئے۔ تو ابھی ہمارے درمیان وہی رسمی گفتگو شروع تھی۔ ہم دونوں منتظر تھے۔ کہ باتوں باتوں میں کوئی ایسا موضوع چھڑ جائے جس پر آزادانہ خیال آرائی کی جا سکے ۔

اِس کی زبان میں بلا کی روانی تھی۔ اور آنکھوں میں بے پناہ حرکت۔ مری سے اُترتے ہوئے بس سڑک کے

بائیں جانب کھڑی ہوگئی۔ اور ڈرائیور قریب کے ہوٹل میں چائے پینے چلا گیا۔ دو تین بسیں پہلے سے رُکی ہوئی تھیں۔ انور مجھے ساتھ لے کر جلدی سے نیچے اُتر آیا ؛

"وُہ دیکھ رہے ہو۔ وُہ لڑکی۔ اس کا لباس کتنا سُرخ ہے یُوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ خُون کے سمندر میں بھگو کر نچوڑ لیا گیا ہو۔ کتنی زبردست جنسی اپیل ہے اس میں" ؛

گھاس کے ایک مخملیں پلاٹ پر وُہ لڑکی نیم دراز تھی۔ نَوعرُوس تھی۔ شاید! بس کے سفر کی وجہ سے چکرا گئی تھی۔ شوہر اسے نمک اور لیموں کے استعمال کی ترغیب دے رہا تھا۔

"یہ لڑکی راولپنڈی تک میرے کمپارٹمنٹ میں تھی۔ رات بہت دلچسپ باتیں ہوئیں" وُہ سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ کیونکہ اس کے لہجے میں اعتماد نہیں تھا ؛

دوبارہ بس میں بیٹھے تو مجھے اُس کے کردار کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ کوہالے میں سامان کی اُلٹ پلٹ اور دُوسری محکمانہ کارروائیوں کے باعث بہت سا وقت ضائع ہو گیا۔ بس دو تین گھنٹوں کے لئے رُکی رہی۔ ہم دونوں گھومتے گھامتے دریا کے دُوسری جانب چلے گئے ؛

وہاں کوئی اچھا سا ہوٹل تو میسر نہ آسکا۔ البتہ انور کو ایک مشغلہ ضرور ہاتھ آگیا۔ مَیں تو طبعاً حد سے بڑھی ہوئی بیباکی کو ناپسند کرتا ہوں۔ مگر انور کی عادات میں اسی چیز کو سب سے بڑا دخل ہے۔ کریانے کی ایک دُکان پر کوئی صُورت دیکھ پائی۔ وہیں شست باندھ کر بیٹھ رہا۔ مَیں نے لاکھ سمجھایا۔ کہ ایک دو ٹکے کی چھوکری پر اس بُری طرح ریجھ بیٹھنا اپنی کور ذوقی اور بیوقوفی کی دلیل ہے۔ مگر اس پر خاک بھی اثر نہ ہُوا۔ مجبوراً اسے وہیں چھوڑ اکیلا واپس لوٹ آیا +

"خو— تمہارا دُوسرا ساتھی کدھر ہے"؟

ڈرائیور اُجڈ قسم کا پٹھان تھا۔ لال لال آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہُوا بولا +

"پتہ نہیں خان"؟

خان بس اسٹارٹ کرتے کرتے رُک گیا۔ اور زیر لب تیز بڑ بڑانے لگا۔ کسی نے آکر خبر دی۔ کہ کل رات بارش ہو جانے کی وجہ سے رستہ خراب ہے۔ ۔ ۔ ۔

انور قریباً بھاگتا ہُوا چلا آرہا تھا۔ "چلوگے۔ اب چلوگے خان —"

خان نے بتایا۔ کہ دومیل سے آنے والی بس کا انتظار ہے ممکن ہے۔ رات کو ہالے میں بس کرنی پڑے۔ یہ منحوس خبر سُنتے ہی ہمارے چہرے اُتر گئے۔ انور ڈرائیور سے سرگوشیوں میں کوئی معاملہ طے کر رہا تھا۔ اور میں اس لڑکی کی طرف تکنے لگا۔ جو ابھی ابھی کریانے کی دُکان پر کھڑی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک خاموش صورت نوجوان بھی تھا۔ اُس نے پیٹھ پر بڑا سا بورا لاد رکھا تھا۔ وُہ لوگ شاید سامنے والی بس کے ڈرائیور سے کرایہ نمٹا رہے تھے ؛

ہماری نشستوں کے عقبی حصّے میں عموماً ایسا سامان تھا۔ جو کشمیر میں نایاب ہوتا ہے۔ یا بہت کم مقدار میں ملتا ہے۔ ڈرائیور سے کہہ سُن کر انور نے اس لڑکی کے بیٹھنے کے لئے وہیں جگہ بنوالی۔ نوجوان نے بوجھ اُتار کر کلینر کے حوالے کیا۔ اور لڑکی کو آخری ہدایات دے کر رُخصت ہو گیا ؛

دومیل سے پہلی بس آنے پر مسافروں میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انور اپنی سیٹ پر نچلا نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مجھ سے بات کرتا۔ جب بھی اُسی لڑکی سے مخاطب ہوتا۔ آخر کار میں نے پُوچھ لیا "یہ کون ہے؟" دیر تک ایسے ہی کھسر پھسر

ہوتی رہی۔ کہنے لگا:۔ اِس کا نام اشمی ہے۔ اسے ولنہ جانا ہے۔ ولنہ بارہ مولے سے چار پانچ میل پرے سری نگر روڈ پر ایک گاؤں ہے۔ وہیں اس کا بوڑھا باپ نون تیل کی دُکان کرتا ہے۔ اور ابھی جو اس کے ہمراہ تھا۔ رشتے میں اس کا بھائی ہے:" کچھ دیر تک میں انور کی معلومات پر دل ہی دل میں اظہارِ تعجب کرتا رہا۔ پھر اُونگھ آ گئی۔ اور مَیں تھوڑی دیر کے لئے اشمی اور انور کی موجودگی سے غافل ہو گیا،

جب ذہن میں چکر کاٹتا ہُوا آلودگی کا غُبار تھما۔ تو چونک کر ایک نظر اشمی کی طرف دیکھا۔ وہ انور کی حرکات و سکنات سے کچھ بے تعلق سی بیٹھی تھی۔ اور اس کی نظریں باہر متحرک مناظر پر سے پھسل رہی تھیں۔ مَیں نے چند لمحوں کے لئے ٹکٹکی باندھ کر اس کے خد و خال کا جائزہ لیا۔ اور مجھے پہلی بار چغتائی کی حقیقت نوازی کا احساس ہُوا۔ انور نے شرارت سے میرے پہلے میں ٹھوکا دیتے ہوئے کہا،

"یہ کشمیر ہے" اور مَیں چونک پڑا — اس کی رُوح سوئی پڑی تھی۔ اتنے سُرخ اور رسیلے ہونٹوں پر کھلنے والی قدرتی مُسکراہٹ غائب تھی۔ سفید چکنے گالوں پر انور کی

تحریک کے آثار ابھی تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا:۔

"اگلے سال پھر کشمیر آؤ۔ تو شاید اس کی مُردہ رُوح جاگ اُٹھے۔ اب تو وُہ خشک اور بے جان چٹانوں کی مانند بے حس ہے"۔

انور نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ مَیں دریائے جہلم کو پہاڑوں کی آغوش میں لہراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اور وُہ اشمی سے باتیں کرنے لگا:۔

"دلنہ جاؤ گی نا"؟

"دلنہ صاب!"

"کیا کرو گی وہاں جا کر" ایسے غیر معروف گاؤں میں۔ جہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔ چلو تم میرا ساتھ دو۔ مَیں تمہیں سری نگر لے چلوں گا۔ وہاں سے پہلگام اور پہلگام سے ہوتے ہوئے ہم پنجاب جائیں گے۔ تُم نے پنجاب دیکھا ہے۔ نہیں دیکھا وہاں لوگ غریب نہیں ہوتے۔ ان کے پاس دل بہلاوے کے لئے طرح طرح کے سامان ہوتے ہیں۔ اور وہ دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں"۔

یہ سب باتیں انور جیسے اسی ایک بات میں کہہ چکا ہو۔۔۔

"اودھر ہمارا باپ ہے۔ اشکرے میں اس کے گھوڑا صاب! اور وُہ صاب لوگ کو درمولا سے گلمرگ لے جاتا صاب! پھر بیماری پڑی۔ اور ہمارا گھوڑا سب کا سب مرو گئے۔"

لڑکی کی آنکھیں چھلک گئیں۔

"تمہارے گھوڑے مر گئے۔۔۔؟" انور نے افسوس کا اظہار کیا۔

"ہاں صاب! اور ہم دلنہ اُٹھ گئے۔ یہ سامان صاب ادھر کوہالے سے ہم اودھار لاتا۔ بکتا تو پونے ایک مہینہ بعد واپس لے آتا۔"

"تمہارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے۔ کہ دُکان میں سودا ڈال سکو۔ اور ریاست کے جو بڑے بڑے محصُول ہیں۔"

"دو میل ادھر۔۔۔۔ چوکیدار ہے۔ ہمارے سامان پر وررت نہیں آتا صاحب!"

چوکیدار کا تصوّر کرتے ہی اُس کے آنسو بھر آئے —

میں نہ آؤں تو دکن دار سودا نہیں دیتا صاب! ادھر دو میل میں چوکیدار ماصُول اُٹھا لیتا۔۔۔" وہ کچھ کچھ کہتے کہتے

رُک گئی۔ غالباً یہی کہنا چاہتی ہو گی "مجھے اسی لئے بھیجا جاتا ہے۔ اسی لئے کہ ......"

مَیں پلٹ کر اس کی آنکھوں میں اُمنڈتے ہوئے جہلم کو تکنے لگا لڑکی اوڑھنی سے آنسُو پونچھ رہی تھی۔ وہ اپنی تلخ زندگی سے اُکتائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے باوجود وُہ ابھی تک اسی طرح بے تعلّق اور کھچی کھچی سی تھی۔ انور سوچ رہا تھا۔ عورت کے آنسو بہ رہے ہیں اس کی زندگی کا کمزور ترین لمحہ قریب ہے ...... اور مَیں ایک بار پھر دُور پستی میں جہلم کو جھاگ اُڑاتے دیکھ کر سوچنے لگا۔ جنّت کشمیر کے آنسو اُبل رہے ہیں۔ پنجاب میں اُن سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جاتا ......

انور نے بات بڑھانے کے لئے کافی ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن لڑکی ہر بار اُسے نظر انداز کر رہی تھی۔ دو میل تک پہنچتے پہنچتے انور بالکل مایُوس ہو گیا۔ اور غیر اختیاری طور پر ایک سرد آہ بھر کر چُپکا ہو رہا۔ مَیں نے کہا "یہ بھی آواز شکستِ دل ہے"۔

"ہاں" انور نے محجوب ہو کر اقرار کیا۔ مَیں نے طنزاً کہا،

"نغمہ سازنہ رُسوا ہو جائے"۔

"کس کا شعر ہے"؟ مگر اس کے ہونٹوں پر مسرت کی چمک بدستور سوئی رہی۔ لڑکی اسے ہمراہ لے کر اپنی ہی غم افزا زندگی میں غوطہ لگا گئی تھی۔ دو میل تک موٹر کی مختلف آوازوں کا اُتار چڑھاؤ کانوں میں گونجتا رہا۔ انور خاموش تھا۔ لڑکی موم کی گڑیا کی مانند چُپ چاپ اپنی اذیت بخش نشست میں دبکی رہی۔ اور میں انور کے کردار سے نفرت کرتے ہوئے بھی اس سے ہمدردی محسوس کرنے لگا۔

دو میل پہنچ کر ہاشمی کی نگاہیں تو کسٹم وصول کرنے والے عملے میں سے چوکیدار کو تلاش کرنے لگیں۔ ہم دونوں اُتر کر ہوٹل میں چلے گئے۔ کھانا کھا کر لوٹے۔ تو ڈرائیور نے ہمیں راشن کارڈ بنوا لینے کا مشورہ دیا۔۔۔ واپس ہوئے۔ تو کسٹم والے ہماری بس چیک کرنے میں مصروف تھے۔ میں نے انور کا ہاتھ دبایا۔

"ہاشمی کو چوکیدار نہیں ملا۔ گھبرائی ہوئی ہرنی کی مانند ابھی تک اسے دیکھ رہی ہے"۔ انور جھلاہٹ کو کسی حد تک دباتے ہوئے بولا "میرے سامنے اس لڑکی کا نام مت لو۔

مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔" اشمی کے سامان کا محصول تین روپے تھا۔ دلنہ گاؤں کا کرایہ ادا کرنے کے بعد اس کے پاس صرف ساڑھے سات آنے بچتے تھے۔ ڈرائیور چیخنے لگا ؛

"ہو — لڑکی۔ تم ماصول کیوں ادا نہیں"؛

"خان! پونسہ ناہیں۔" اشمی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی؛

"پونسہ ناہیں۔ یہ سامان کدھر سے لائی۔ خالی کر دو ہمارا گاڑی —— اُترو ——" خان گرج کر بولا۔ اور اشمی سہم کر سکڑ گئی۔ چہرے پر زردی کھنڈنے لگی ؛

انور بد دل سا بیٹھا بس کے چلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اور بس اشمی کے محصول کی عدم ادائیگی کے باعث رُکی کھڑی تھی۔ انور نے اشمی اور میری جانب دیکھے بغیر روپے نکال کر ڈرائیور کے حوالے کئے۔ "لو خان اس کے سامان کا محصول"؛

گیرٹ کھل گیا۔ اور بس اسٹارٹ ہو گئی۔ انور بے حسی کے عالم میں میٹر پر نگاہیں جمائے بیٹھا رہا۔ میٹر کی سوئی ٹوٹ کر ایک طرف لگی کھڑی تھی۔ رفتار کے اندازے کے لئے محض قیافے پر انحصار تھا۔ اشمی مجھ سے مخاطب ہوئی "صاب!" وہ انور سے حجاب محسوس کر رہی تھی۔ مَیں نے انور کو اشارہ

کیا۔ کہ وہ تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ انور اُس کی طرف متوجہ ہُوا۔ اور گفتگو کا ایک لامعنی سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ مگر انور کی شوخ طبیعت گھٹی رہی اس کی باتوں میں پہلی سی آوارگی اور شگفتگی نہ آسکی۔ جیسے وُہ ایک جست میں بچپنے سے بُڑھاپے تک پہنچ چکا ہو۔ اس کی آنکھوں کی تیکھی چمک غائب تھی۔ اور طبیعت کا لا اُبالی پن.....!

پٹرول کی بُو سے دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی—— آخر ایک انسان نے دوسرے انسان کو پہچان لیا۔ اپنے جذبات میں کھویا ہُوا انور انسانیت کی ازلی و ابدی شاہراہ پہ رواں دواں ہے —— میں کھڑکی میں کہنی لٹکائے سوچ رہا تھا۔ انور نے میری تمامتر ہمدردی جیت لی ہے!

اشمی کی آنکھوں میں محبّت کے کسی آوارہ جذبے کی بھی کوئی لاگ نہیں تھی۔ نہ وُہ انور کے سلوک سے کسی طرح متاثر معلوم ہوتی تھی۔ پھر بھی وُہ انور سے اپنی تلخ زندگی کے حالات کہہ رہی تھی۔ واقعات ایک اَن تھک تسلسل کے ساتھ دوبارہ اِس پر بیت رہے تھے۔ مَیں نے اس کی آنکھوں سے دل کی کیفیت بھانپ لی۔ اجنبیت کے تمام پردے

اُٹھ چکے تھے۔ وہ محویت کے عالم میں انور سے نہیں ایک مرد سے مخاطب تھی۔ ایک مرد سے جو بیوپاری تھا۔ تو اس کی دلنہ والی چھوٹی سی دُکان کے لئے سودا اُدھار دیتا۔ دو میل میں وہی مرد اس کے آڑے آتا۔ وہاں چوکیدار کی وجہ سے اُسے محصُول کی بچت ہو جاتی۔ آج چوکیدار تو شاید مہینوں کا کمایا ہُوا روپیہ بیوی بچّوں کو دینے پونچھ چلا گیا تھا۔ لیکن وہ مرد وہاں بدستور موجود تھا۔ اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے۔ اسے کسٹم والوں کی گرفت سے آزاد کرنے کے لئے.....

انور کہہ رہا تھا" تمہیں مُسکرانا آتا ہی نہیں۔ حالانکہ تم ایسی لڑکی کے لئے یہ چیز بہت ضروری ہے" لیکن یہ کہتے ہوئے بھی اُس کی آنکھوں میں وُہ چمک پیدا نہیں ہوئی۔ جس نے کچھ دیر پہلے مجھے اس سے متنفر کر دیا تھا۔ وُہ پُرسکون تھا۔ جیسے حساب کا سوال حل کر رہا ہے۔

انور نے اپنا راشن کارڈ بھی میری نگر کے لئے بنوا لیا تھا۔ مَیں سوچنے لگا۔ کاش یہ شخص میرے ساتھ بارہ مولے رہ جائے۔

سرسبز پہاڑوں کے سائے جہلم کے پُرشور دھارے پر پھیل گئے۔ ہوا پھرر۔ پھرر بس کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

انور کہنے لگا۔" یہ ہوا بارہ مولا میں بلا ناغہ چلتی ہے۔ مغرب سے مشرق کی جانب جہلم کی مخالف سمت میں۔ اس وقت لہریں زیادہ تند ہو جاتی ہیں۔ اور ولر میں تو اتنا تباہ کُن تموّج پیدا ہوتا ہے۔ کہ تین چار بجے کے بعد کوئی ہانجی ادھر کا رُخ نہیں کرتا۔"

پتھر کی سلوں کے پہاڑ کا آخری موڑ کاٹتے ہوئے بس ایک کُشادہ بازار کے ناکے پر کھڑی ہو گئی "بارہ مولا" انور زیرِ لب گنگنا کر اپنا ہینڈ بیگ سنبھالنے لگا۔ اٹیچی کیس اور دیگر مختصر اشیا جو چلتے وقت کلینر نے سیٹ کے نیچے ٹھونس دی تھیں۔ مَیں نے ایک ایک کر کے باہر نکال لیں۔ اِس خیال سے کہ اُترتے ہوئے وقت کا سامنا نہ ہو۔ اور اطمینان سے اپنا سارا سامان چیک کر سکوں۔ بس کے گرد قُلیوں کے ایک ٹھٹ کو دیکھ کر کچھ دیر دروازے میں کھڑا رہا۔ پلٹ کر انور کو دیکھنا چاہا۔ تو وہ سڑک پر کھڑا کھڑا چلّا اُٹھا:

"آئیے صاحب! مَیں ادھر کھڑا ہُوں"

اور مَیں سوچنے لگا۔ انور کو سری نگر جانا تھا۔ مگر سامان بارہ مولے اُتروایا جا رہا ہے۔ اشمی کا باپ ولنہ میں سڑک کے

کنارے بیٹھا اس کے انتظار میں ہر آنے والی بس کا جائزہ لیتا ہو گا۔ اور یہ انور کے پہلو میں دبکی کھڑی ہے۔ اس کا بورا انور کے سامان کے ساتھ پڑا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"تم نے اشمی کے لئے محصول ادا کیا تھا نا"۔ میرا طلسم پھر ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

"آج رات ہم ہندوستانی یونین ہوٹل میں ٹھہریں گے"۔

میں نے تڑپ کر انور کی آنکھوں میں جھانکا۔ میرا خیال تھا۔ اب تو وہ آنکھیں اس آگ کی بے پناہ حدّت سے روشن ہوں گی لیکن وہاں تو اب بھی اس تیز چمک کے آثار نہیں تھے ۔ مجھے اپنی مسلسل غلط فہمی پر بیحد افسوس ہوا۔

"عزیزہ!"

"جی صاب!"

"ہندوستانی یونین ہوٹل کے علاوہ کوئی اور ہوٹل بھی ہے یہاں"؟

"ایک دو اوٹل صاب! ۔ ۔ ۔"

"وئیں ٹھہرے گا نا جناب ۔ بوت اچ اوٹل ہے صاب!"

——— انور کی آنکھوں نے مجھے کس قدر دھوکہ دیا ہے۔ ان کی خاموشی اور ٹھہراؤ میں وہ چمک بدستور کام کرتی رہی۔ اور مَیں اسے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ جان سکا

....

"عزیزہ!"

"جی صاب!"

"سامان اُٹھاؤ! ہم لیک ویو ہوٹل میں ٹھہریں گے"۔

عزیزہ نے سامان پیٹھ پر لاد لیا۔ اور مَیں نے آخری ہمدردانہ نظر سمٹی سکڑی اشمی پر ڈالی۔ اس وقت مجھے انور کی موجودگی کا احساس نہ تھا۔

مُراجعت

بطخیں شور مچاتیں ۔ کرڑانک ۔ کرڑانک ۔ غرک ..... غرک کرتی حوض کی طرف لپکتیں ۔ ڈربوں کے کھُلتے ہی مُرغیاں اور ننھے مُنے چُوزے صحن میں بکھر جاتے ۔ اور باجرے کے چوگے پر ٹوٹ کر پل بھر میں ایک ایک دانہ زمین سے چُن لیتے ۔ سیکس نسل کا کم خور مُرغا وہ ایک دانے چونچ میں لے کر بیتابی سے کڑک کڑک کرتا ۔ اس کے پہلو والی مُرغی متوجّہ ہو کر اس کی نذر قبول کر لیتی ۔ پھر وہ دائیں بازُو کو پھیلا کر نصف قوس میں مُرغی کے گرد گھُوم جاتا ۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ایک بانگ دے ڈالتا ۔ یا چھاتی پھیلائے ۔ سینہ تانے ۔ تول تول کر قدم رکھتا ہُوا اِدھر اُدھر اینڈتا پھرتا ۔ اس بڑے مُرغ کے علاوہ اور بھی کئی قد آور مُرغ تھے ۔ ان میں اصیل نسل اس راجدھانی کا دست و بازُو تھی ۔ یہاں کی کھشتری

ذات۔ پنجے پر تیز اور مضبوط چونچ۔ چہرے پر زخموں کے کھرنڈ۔ کلغی سیاہی مائل۔ اور اُنگلیوں پر فولاد کی سی خاریں۔ جو لڑتے وقت حریف کے چہرے کو دو تین منٹ میں لہولہان کر دیتیں ؛

سیکس نسل کے مُرغے کو سہراب کے نام سے پُکارا جاتا تھا۔ وہ دُوسروں کی نسبت یُوں بھی زیادہ نازو نعم سے پلا تھا۔ سفید سفید کانوں والی ولایتی مرغیوں سے بھی زیادہ اس کے آرام اور خوراک کا خیال رکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اس کے سبھی پر صحیح و سلامت تھے۔ موسم آنے پر شگوفے پھُوٹتے۔ تو وہ لالہ زار بن کر رہ جاتا۔ نرم نرم نارنجی کونپلوں کے اُگ آنے سے اس کی خوبصورتی میں بیحد اضافہ ہو جاتا!

ایک تیسری ذات تھی شُودر! ——— دیسی نسل جسے اب تک کوئی نام دینے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ اِس کا ڈربہ بٹیوں سے بھر جاتا۔ بچے آکر گردن مروڑ دیتے۔ ٹانگ کھینچ لیتے۔ پروں کو نوچ نوچ کر اسے بیحال کر دیتے۔ وہ چیختی چلاتی اور بچے تالیاں پیٹ پیٹ کر خوش ہوتے۔ اور اس کی بے کیف زندگی سسک سسک کر رینگتی رہتی ؛

شروع شروع جب وُہ اس فضا میں لائی گئی۔ تو اس کے

بیرنگ پروں، معمولی اور نامانوس شکل و شباہت دیکھ کر ہر طرف سے احتجاج کی آوازیں سُنائی دیں۔ معمّر ہم جنسوں کی تو خیر معمولی بات ہے۔ درمیانی قد و قامت کے شریر چوزے بھی داؤ لگنے پر اسے ٹھونگ جاتے وُہ بھاگی بھاگی پھرتی کبھی ایک کونے میں دبک کر اُن کی نظروں سے اوجھل ہونے کی کوشش کرتی۔ اور کبھی کسی اور پناہ میں۔ آہستہ آہستہ کسی حد تک مانُوس ہوئی۔ تفاوت کا احساس مٹا۔ تو ان سب میں مل جل کر دانہ دُنکا چُگنے لگی۔ صُبح ڈربہ کھُلتے ہی وُہ بھی اسی تیزی اور اشتیاق سے تیر کی مانند باہر جھپٹتی۔ سہراب اپنی پُرانی عادت کے مطابق۔ اس کے گرد دو ایک بار گھُوم جاتا۔ اور وُہ اس کی چونچ سے نذرانہ وصول کر لیتی ؛

لمبی لمبی گردنوں والی سفید بطخیں حوض کے اُدھر سائے میں کھڑی رہتیں۔ ورنہ پانی میں گھُس کر تیرا کرتیں۔ ان کی پست قامت نسل دن کا بیشتر حصّہ حوض میں مکوڑوں کا شکار کیا کرتی۔ ان کے چھوٹے چھوٹے پیلے رنگ کے بچّے پانی کی سطح پر زرد رنگ کے گالوں کی مانند تیرتے۔ جنگل کی سبک چڑیوں کی مانند ننھّی ننھّی دُمیں ہلاتے۔ اِدھر اُدھر بکھرے

نظر آتے +

گئے موسم میں اُس نے بہت سے انڈے دیئے تھے ڈربے کے پچھی کونے میں بھوسے کی ایک تہہ بنا دی گئی۔ ہر روز صبح وہاں سے ایک سفید تازہ اُٹھا لیا جاتا۔ اور وُہ لگاتار انڈے دیتی رہی۔ ایسی ان گنت صبحیں گزر گئیں +

موسم سرما کے اوائل کی ایک صبح کو اس ڈربے سے انڈے برآمد ہونے بند ہو گئے۔ اور وُہ پروں کو سکیڑے سمٹی سمٹائی بیٹھی رہی ذرا سی دیر کے لئے باہر نکلی تھی۔ تو اِدھر اُدھر گھوم پھر کر پھر وہیں دبک گئی۔ جیسے انڈوں پر بیٹھی آیندہ نسل کی تعمیر میں مشغول ہو۔ مگر اس کے نیچے گرم گرم بھوسے کے چند تنکوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ آس پاس سفید۔ سیاہ بیٹوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ اس کا ڈربہ سب سے آخر میں تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ صفائی کے وقت اسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا +

دُوسرے دن کی شام تک بغیر کچھ کھائے پیئے، وہ ڈربے کی دیوار کے ساتھ لگی رہی۔ بچّے پُرانی عادت کے مطابق ایک بار اس کے قریب آئے۔ مگر اس کی خشمگیں آواز سُن کر ڈر گئے۔ اس کے بیٹھنے کا انداز بھی کچھ ایسا پُر اسرار اور ڈراؤنا سا تھا۔

کہ بچے دوبارہ قریب نہیں پھٹکے۔ اور وہ شام تک اسی ایک نشست میں بیٹھی آنکھیں جھپکاتی رہی +

جھٹپٹے کے وقت ایک شخص اس کے ڈربے کے قریب آ کھڑا ہوا۔ دروازہ کھول کر اُس نے نہایت بے رحمی سے اسے دبوچ لیا۔ اور دونوں بازو ایک ساتھ ملا کر بائیں ہاتھ کی گرفت میں لے لئے وُہ بہت دیر تک خوفناک آوازوں سے اپنی دُوسری ہم جنسوں کو مدد کے لئے پکارتی رہی۔ آواز سُن کر بطخوں اور مُرغیوں نے ایک ساتھ گردنیں اُٹھا اُٹھا کر دن کی ٹمیلی روشنی میں آنے والے خطرے کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ ہاتھ کی گرفت زیادہ سخت ہونے کے باعث اس کی آواز بند ہوگئی۔ اور وُہ کچھ دیر کے لئے بے حس ہوگئی۔ پھر اس شخص نے اسی بے رحمی سے اسے پانی میں دو تین غوطے دیئے پانی سے نکل کر اس نے جسم پھڑپھڑایا۔ اور پانی کی وہ مقدار جو اس کے پروں میں چھپی پڑی تھی۔ پرے جھٹک دی۔ پھر اس شخص نے اس کے بازو سے ایک پر اُکھیڑ لیا۔ اور اس کے نتھنوں میں ٹھونس کر اسے دوبارہ ڈربے میں بند کر دیا +

چند لمحوں کے لئے نتھنوں میں ٹھنسے ہوئے پر نے اُسے

سخت تکلیف دی۔ جھلاہٹ کے عالم میں وہ اُسے پنجوں سے کُریدتی رہی۔ نکال پھینکنے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر آہستہ آہستہ اس کی موجودگی کے احساس سے غافل ہو کر خشک اور ویران رات کی پھیلائی ہوئی بے حسی میں ڈوب گئی ٭

علی الصبح معمول کے مطابق ڈربے کا دروازہ کھُلا۔ تو وُہ تیر کی مانند باہر لپکی۔ آیندہ نسل کو تعمیر کرنے کا جذبہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ اسی انداز میں باجرے کے دانوں پر لپک رہی تھی۔ البتہ اس کا جسم پہلے سے کچھ ہلکا ہلکا سا تھا۔ وہ اِدھر سے اُدھر اُڑ رہی تھی۔ سہراب اکڑتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اور وہ دبک گئی .....

اس نے کئی بار انڈے دیئے۔ ان گنت انڈے۔ حالانکہ اس کے قریب کے ڈربوں میں بند رہنے والی مُرغیوں نے درجن بھر سے زائد کبھی انڈے دیئے ہی نہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو انہیں وقف آنے پر کبھی حوض کے ٹھنڈے اور سبزی مائل پانی میں غوطے دیئے جاتے تھے۔ اور نہ بازو کا پَر ان کے نتھنوں میں ٹھونسا جاتا تھا۔ بلکہ اس وقت ڈربوں کی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا۔ اور مٹی کی بنی ہوئی

ایک طشت نما انگیٹھی میں خس کی تہ جما کر انڈے ٹکا دیئے جاتے۔
اس کے بعد وہ ٹکڑی ہوئی اصیل مرغیاں دن رات انڈوں
پر بیٹھ کر انہیں گرمی پہنچاتیں۔ حتیٰ کہ اکیسویں دن ننھے ننھے
خوبصورت چوزے نکل آتے۔ پھر وہ اپنی اپنی جلو میں
لے کر سارے صحن کا چکر لگاتیں۔ ننھے ننھے چوزے چوں
چوں کرتے ان کے پیچھے بھاگتے۔ کسی چیل کو آسمان پر چکر
کاٹتے دیکھ کر بچوں کی ماں کڑک کرتی۔ اور چوزے ایک
ساتھ بھاگ کر اس کے پروں کے نیچے آکر چھپ جاتے۔
صحن پر موٹی جالی کا ایک طویل و عریض پردہ سایہ ریز تھا۔
اس لئے چیلیں آسانی کے ساتھ اس ننھی پود پر جھپٹ نہیں
سکتی تھیں۔ تاہم چوزے اپنی اس شفیق اور قدرتی پناہ سے
ذرا دیر کے لئے ننھا سا سر نکال کر ایک نظر گرد و پیش کا
جائزہ لیتے۔ اور پھر غائب ہو جاتے ؛

اس کے انڈوں کی تعداد کا اندازہ نہیں تھا۔ تاہم وہ
اس دوڑ میں ولایتی ہمجنسوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہ تھی۔
سوائے ایسی مرغیوں کے جو سدا بہار ہوتی ہیں۔ کبھی انڈے
دینے سے نہیں اکتاتیں۔ وہ باقی سب پر سبقت لے جا چکی

سخت تکلیف دی۔ جھلاہٹ کے عالم میں وہ اُسے پنجوں سے کُریدتی رہی۔ نکال پھینکنے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر آہستہ آہستہ اس کی موجودگی کے احساس سے غافل ہوکر خشک اور ویران رات کی پھیلائی ہوئی بے حسی میں ڈوب گئی ؛

علی الصبح معمول کے مطابق ڈربے کا دروازہ کُھلا۔ تو وہ تیر کی مانند باہر لپکی۔ آیندہ نسل کو تعمیر کرنے کا جذبہ ختم ہوچکا تھا۔ وہ اسی انداز میں باجرے کے دانوں پر لپک رہی تھی۔ البتہ اس کا جسم پہلے سے کچھ ہلکا ہلکا سا تھا۔ وہ اِدھر سے اُدھر اُڑ رہی تھی۔ سہراب اکڑتا ہُوا اس کے قریب آیا۔ اور وہ دبک گئی .....

اس نے کئی بار انڈے دیئے۔ ان گنت انڈے۔ حالانکہ اس کے قریب کے ڈربوں میں بند رہنے والی مُرغیوں نے درجن بھر سے زائد کبھی انڈے دیئے ہی نہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو انہیں وقف آنے پر کبھی حوض کے ٹھنڈے اور سبزی مائل پانی میں غوطے دیئے جاتے تھے۔ اور نہ بازو کا پَر ان کے نتھنوں میں ٹھونسا جاتا تھا۔ بلکہ اس وقت ڈربوں کی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا۔ اور مٹّی کی بنی ہوئی

ایک طشت نما انگیٹھی میں خس کی تہ جما کر انڈے ٹکا دیئے جاتے۔ اِس کے بعد وُہ ٹسکڑی ہوئی اصیل مُرغیاں دن رات انڈوں پر بیٹھ کر انہیں گرمی پہنچاتیں۔ حتّٰی کہ اکیسویں دن ننھے ننھے خوبصورت چُوزے نکل آتے۔ پھر وُہ اپنی اپنی جلو میں لے کر سارے صحن کا چکر لگاتیں۔ ننھے ننھے چُوزے چُوں چُوں کرتے ان کے پیچھے بھاگتے۔ کسی چیل کو آسمان پر چکر کاٹتے دیکھ کر بچّوں کی ماں کڑک کرتی۔ اور چُوزے ایک ساتھ بھاگ کر اس کے پَروں کے نیچے آکر چھُپ جاتے۔ صحن پر موتیا جالی کا ایک طویل و عریض پردہ سایہ ریز تھا۔ اِس لئے چیلیں آسانی کے ساتھ اِس ننّھی پود پر جھپٹ نہیں سکتی تھیں۔ تاہم چُوزے اپنی اس شفیق اور قدرتی پناہ سے ذرا دیر کے لئے ننّھا سا سر نکال کر ایک نظر گردوپیش کا جائزہ لیتے۔ اور پھر غائب ہو جاتے ؛

اِس کے انڈوں کی تعداد کا اندازہ نہیں تھا۔ تاہم وہ اس دوڑ میں ولایتی ہمجنسوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہ تھی۔ سوائے ایسی مُرغیوں کے جو سدابہار ہوتی ہیں۔ کبھی انڈے دینے سے نہیں اُکتاتیں۔ وہ باقی سب پر سبقت لے جا چکی

تھی۔ اس کے باوجود جب انڈے سینے کی کیفیت اِس پر طاری ہوتی۔ کھانا پینا ایک دم چھوٹ جاتا۔ اس کے ساتھ ہمیشہ وہی سلوک کیا جاتا۔ جو اس راجدھانی میں کسی رنگ اور کسی نسل سے روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ اُس نے آج تک انڈوں پر بیٹھ کر انہیں سینے کی سعادت حاصل نہیں کی تھی۔ نہ وُہ اس کھُلے صحن میں پیارے پیارے بچّوں کو ساتھ لے کر اس شان سے چلی تھی۔ جو دُوسری نسلوں کا معمول تھا۔

دن گزرتے گئے۔ خوراک کی کمی کے باعث اس کے وزن میں بھی کمی ہو رہی تھی۔ ایک دن ڈربے سے نکلتے نکلتے اس نے کچّی حالت ہی میں انڈہ گرا دیا۔ چند دنوں تک یہی کیفیت رہی۔ اور پھر سمٹنے سُکڑنے لگی۔ جیسے سُوکھے ہوئے ہلکے پھُلکے جسم میں ایک بار اور انڈے سینے کی تاب کروٹیں لے رہی ہو۔

اِس دفعہ اس کے ساتھ کوئی سفّاکانہ طرزِ عمل روا نہیں رکھا گیا۔ بلکہ جو واقعات اب اسے پیش آئے۔ اس کے لئے وہ بالکل ایک تجربے کی حیثیّت رکھتے تھے۔ لیکن وُہ نیا تجربہ

رکتنا فطری تھا۔ وُہ آپ سے آپ اِس کی سب اُونچ نیچ سے واقف ہو چکی تھی۔ مٹی کی طشت نما انگیٹھی میں خس اور بھوسے کی تہ پر انڈے ایک خاص ترتیب سے چُن دیئے گئے تھے۔ اور جب اسے اُٹھا کر وہاں رکھا گیا۔ تو اس کے حلق سے احتجاج کی ہلکی سی آواز بھی نہ نکلی۔ وہ چُپ چاپ بیٹھی رہی۔ حتیٰ کہ ڈربے کا دروازہ بند ہو گیا +

اکیس دن تک انڈوں میں کسی قسم کی زندگی کے آثار نمودار ہو سکے حالانکہ دُوسری مُرغیاں اسی مدّت کے اندر اندر انڈے سی لیا کرتی تھی۔ ٹک۔ٹک کی ایک مسلسل آواز نکلتی رہتی۔ اور وُہ پنجوں اور چونچ کی مدد سے انڈوں کو اُلٹتی پلٹتی رہی +

ایک ایک کر کے دن اسی طرح گزر گئے۔ گویا وقت کی یہ تفاوت کبھی پیش تھی ہی نہیں۔ زندگی کی رفتار وہی تھی۔ سردی کی شدّت میں کوئی فرق بھی نمودار نہیں ہُوا تھا۔ لیکن وُہ ڈربہ جو صحن کے آخری سرے پر رکھا تھا۔ اکتیسویں دن ایک نئی حیات کی آمد سے گھر بھر میں بہت اہمیت اختیار کر چکا تھا +

کتنی محنت سے درمیانی وقفہ میں وُہ انڈوں کو اُلٹتی پلٹتی رہی مگر وُہ انڈے جو عام حجم سے ذرا بوجھل تھے۔ اُن کا چھلکا سفیدی مائل اور شکل و صورت میں ایک بے نام سی تفاوت تھی ..... مگر ممتا کا وُہ بھُوکا پیاسا جذبہ۔! جو حالات کے ہاتھوں پیاسا رہا۔ صرف ایک سہارے کا متلاشی تھا۔ اِس بھُوکی پیاسی ماممتا کے لئے یہی امرت تھا۔ یہی زندگی۔ اور یہی حیات کا سب سے بڑا مقصد!

اس رات سرد ہوا چلنے کے باعث فضا سخت ناگوار ہوگئی تھی۔ ڈربوں کی چھتوں پر سفید سفوف کی ہلکی سی تہ جم گئی تھی۔ اور لکڑی کے ریشوں میں پانی کے جذب شُدہ قطروں کے نشانات تھے۔ حوض کے نیلے اور سرد پانی کی سطح سُورج کے طلوع ہونے تک جمی رہی۔ ڈربے کی ایک درز میں سے روشنی کی کرنیں اندر آئیں۔ تو وہ اپنے فرض کی تکمیل کر چکی تھی۔ انڈوں کے خول ٹُوٹ پھُوٹ کر ادھر اُدھر سرک گئے تھے۔ اور ان کے بیچوں بیچ کتنے ہی جاندار بچے تھرک رہے تھے +

روشنی اور بڑھی ——— لیکن وہ بچے اِن بوُزوں سے

کسی طرح بھی مشابہ نہ تھے۔ جو دُوسری مُرغیوں کی جلو میں اکثر دیکھے گئے تھے۔ اُن کی آوازیں معصُوم پیاری اور مختصر تھیں۔ مگر لہجہ اور بولنے کا انداز مختلف تھا۔ سرما کی برفیلی ہوا سے بچانے کے لئے وُہ دن چڑھے تک انہیں جسم کی گرمی پہنچاتی رہی +

دھوپ کی گرمی اور تیزی کے باعث موسم کسی حد تک قابل برداشت ہُوا۔ تو اس کے ڈربے میں بھی صفائی کی جانے لگی۔ اس وقت سفید سفید بطخیں پانی میں گھُس چکی تھیں۔ اور سُورج کی طرف گردنیں بڑھا بڑھا کر شور مچا رہی تھیں۔ جیسے رات بھر کی سردی کے خلاف اگنی دیوتا سے شکایت کر رہی ہوں۔ ان کی آوازوں میں زندگی ناچ رہی تھی۔ اور سرما کی اس سہانی دھوپ میں ان کے ڈھلے ہوئے جسم نکھر گئے تھے۔ انڈوں کے خول۔ گھاس پھوس اور بھوسے کے تنکے بیٹوں کے ساتھ ہی باہر پھِنکوا دیئے گئے۔ ڈربے میں پہلی بار اتنے اہتمام سے صفا ہو رہی تھی۔ مٹّی کی انگیٹھی وہاں سے اُٹھا لی گئی۔ اتنی دیر وُہ بچّوں کو سمیٹے پرے کونے میں بیٹھی کڑک کڑک ..... کڑک ..... کڑک کرتی رہی ــــ صفائی کرنے والا

چلا گیا۔ اور وُہ تھوڑی دیر اپنے مختصر فرش پر۔ پَر پھیلائے۔ قدم قدم پر بچّوں کو اپنے تعاقب میں آنے کی ترغیب دیتی ہوئی گھُومتی رہی۔ مگر پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے بطخوں کے بچّوں سے وُہ روئی کے گالے کس قدر مشابہ تھے ان کے پنجے۔ چونچیں۔ اور جسم کی ساخت بالکل ویسی ہی تھی ۔۔۔۔

ڈربے کا دروازہ چوپٹ پا کر وُہ باہر چلی آئی۔ دھنکی ہوئی رُوئی جیسے ننھے مُنّے گیند۔ ایک بے ڈھب انداز سے لڑھکتے ہوئے اُس کے ہمراہ تھے۔ مگر اُسے زیادہ دیر کے لئے صحن میں اِدھر اُدھر گھُومنے نہ دیا گیا۔ نہ وُہ بچّوں کو لے کر کونے میں پڑے ہوئے کُوڑے کے ڈھیر پر گئی۔ اور نہ وہ بچّوں کو گھر کی موری میں لے جا کر انہیں کیڑے مکوڑے شکار کرنے کا گُر بتا سکی۔ ذرا دیر کے لئے کھُلی دھوپ میں آزاد پھرنے کے بعد اسے جلد ہی ڈربے کی سیلی فضا میں دھکیل دیا گیا دُوسری مُرغیاں معمول کے مطابق بچّوں کو ساتھ لئے حوض کے کنارے کنارے پڑے ہوئے کیچڑ کو کریدنے میں مشغول تھیں۔ بڑے بڑے قد کی بطخیں کم گہرے پانی میں تِج ۔۔۔ تِج ۔۔۔۔۔ تِج لگاتار خوراک حاصل کرنے میں منہمک تھیں۔ شکار گہرائی میں

چلا جاتا۔ تو دُم آسمان کی جانب اُٹھا کر نصف سے زیادہ پانی کے اندر غوطہ لگا دیتیں۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا۔ گویا کاغذ کے کئی مخروطی کنٹوپ پانی میں تیر رہے ہوں +

بیس اکیس دن پھر گزر گئے۔ اِس اثناء میں وہ اُنہیں اپنے ساتھ مانوس کرنے کی انتہائی کوشش کرتی رہی — آخر کار اسے بھی دُوسری مُرغیوں کی مانند صحن میں آزاد چھوڑ دیا گیا۔ وُہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے تیز تیز مگر بہکی ہوئی تیز چل رہی تھی۔ نصف قوس میں گھُوم کر ایک نظر بچّوں پر ڈالتی اور انہیں اپنے ساتھ رہنے کی تلقین کرتی دانہ دُنکا دیکھ کر انہیں بُلاتی اسی طرح حوض کے کنارے کنارے ایک آدھ فٹ تک پھیلے ہوئے کیچڑ تک چلتی گئی۔..... پھر..... ایک بچّہ پانی میں جا پڑا۔ وہ بیتاب ہو گئی۔ بچّہ ننھّے ننھّے پنجوں میں پانی میں تیرتا جا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی سی دُم زور زور سے ہل رہی تھی۔ جیسے اپنی سوتیلی ماں کو الوداع کہہ رہا ہو +

یکایک بے شمار ننھی منی دُمیں پانی کی سطح پر سے ہلتی نظر آنے لگیں۔ وُہ کنارے پر کھڑی بیتابانہ کڑک کڑک کر رہی تھی۔ اور اس کے بچّے پھر..... پھر..... پانی میں

کُود کر ان بطخوں کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ جو ڈوبرے کنارے کے قریب گندے اور سبز رنگ کے پانی میں چُچ۔ چرچ - چُچ - چُچ مکوڑوں کا شکار کر رہی تھیں ۔

وُہ حوض کے گرد چکّر لگا رہی تھی۔ اور بوکھلاہٹ کے عالم میں پانی پر جُھکی پڑتی تھی۔ کرڑک ..... کرڑک ..... کرڑک .... مگر یہ آواز جو وُہ ہر روز سُنتے۔ ان کے کانوں پر اب بھی ایک اجنبی اور بھُولی بھٹکی صدائے آوارہ تھی ۔

چھوٹی بطخوں کی چونچوں میں پانی کے گھونٹ کھنگالے جا رہے تھے۔ تند آور بطخوں نے دو دھیا پر فضا میں جھٹکائے۔ اور موری میں سے داخل ہوتے ہوئے نیولے کو دیکھ کر زور سے چلّائیں۔

کرڑانک ...... کرڑانک ....

کرڑک ...... کرڑک .....

کرڑانک ...... کرڑانک ...... کرڑک ... کرڑک ...

نئے نظام تک

وہ مصر، عراق، اور شام میں دادِ شجاعت دے کر واپس آیا تھا ——— !

اِس کے ذہن میں آپ سے آپ وہ بورڈ اُبھرنے لگے جنہیں بیکاری کے زمانے میں وہ بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اور جب آرٹسٹ کے ہاتھوں کا تخلیق شدہ نوجوان تین اُنگلیاں بڑھا کر اسے کہتا سُنائی دیتا "اچھی تنخواہ اچھی خوراک اور جلدی ترقی"۔ تو اسے اپنے پیٹ میں بہت بڑا خلا محسوس ہوتا اور وہ سوچنے لگتا کہ یہ جگ جگ کا بھوکا پیٹ کسی طور تو بھرے "!"

وہ عرصہ سے کسی راہ نما کی تلاش میں تھا۔ اور راہ نما سڑک کے ہر موڑ پر۔ باغ کے ہر گوشے میں۔ ہوٹل۔ قہوہ خانے اور ریلوے سٹیشن پر ہر جگہ کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔

ایک دن اس نے اپنے راہ نما کو پہچانا۔ خوشی اور مسرت سے
اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کے پیٹ کی آگ غلیم کے دستوں
پر آتش گیر بم بن کر گرنے لگی۔ اطالیہ کے سمن زار۔ جرمنی اور
جاپان کے مرغزار اس کے پیٹ کی عالمگیر آگ کو دیکھ کر
مرجھا گئے۔ فضا سے بمباری ہوتی رہی۔ ہزاروں اور لاکھوں
ٹن آتش گیر مادہ شہروں پر برستا رہا۔ اور سرمایہ اس کے افلاس
کا تاوان پورے چھ سال ادا کرتا رہا +

ملٹری سے ڈسچارج ہونے کے بعد وہ پھر بیکار تھا۔
زندگی کی شاہراہ پر ایک بار پھر وہی موڑ آ چلا تھا جسے وُہ
آج سے چھ سال قبل طے کر چکا تھا۔ اور جس دن سے اس کی
بیکاری کی تاریخ شروع ہوئی اس کے وزن میں اب تک
دس پونڈ کی کمی رونما ہو چکی تھی۔ یہ کمی بیکاری کے تلخ احساس
سے کچھ کم رُوح گزار نہ تھی۔ اس کا بھرا بھرا چہرہ مرجھانے لگا۔
اور جسم کے نکھار پر گرد اُڑنے لگی +

اس نے میدان جنگ میں نوکیلی سنگینوں سے دُشمن کے سینے
چھید ڈالے تھے۔ سیسہ برساتی ہوئی مشینوں سے مدمقابل کی
صفیں بھسم کر ڈالی تھیں۔ دستی جنگ میں عظیم الجثہ سپاہیوں کی

گردنیں مروڑ دی تھیں۔ اس نے دادِ شجاعت دی تھی۔ لیکن ــــ وہ شجاعت ـــــــ اس کے جسم میں کہاں سے چلی آئی۔ اسے یاد پڑا۔ کہ ڈاکٹر خوراک میں حیاتین کی مناسب مقدار کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہی خوراک تھی جس نے اس کے جسم کی تعمیر میں حیرت انگیز سُرعت سے کام لیا ـــــ اور یہ سب اِس لئے ہُوا۔ کہ ڈاکٹروں کو شجاعت کی ضرورت تھی۔ اور جب تک ان کی ضرورت مُنہ پھاڑ پھاڑ کر چلّاتی رہی۔ انہوں نے اس کے جسم کی مشین کو اہمیت دی۔ اس سے زیادہ سے زیادہ شجاعت کشید کی۔ کل پُرزوں کی دیکھ بھال میں اپنا علم اور تجربہ صرف کیا۔ ذرا سا نقص پیدا ہونے پر پُوری جانفشانی سے کام کیا۔۔۔۔

اس کے کانوں کے قریب کسی کوچوان کی گالیاں تھرائیں اور ایک کھڑکھڑاتا ہُوا بوسیدہ سا تانگہ۔ اس کے قریب آکر رُک گیا۔ چابک فضا میں لہرایا۔ تڑاخ! جانور کے تھکے ٹُوٹے جسم میں احتجاج نے انقلاب پیدا کر دیا۔ گھوڑے کی بے ہنگم دولتیوں سے تانگے کا ایک تختہ نکل گیا۔ دھرا ٹُوٹ کر لٹکنے لگا۔ سارا ساز و سامان ہی ٹُوٹ پھُوٹ گیا +

اس کی بغلوں میں خواہ مخواہ ایک عجیب قسم کی حرکت عُود

کر رہی تھی پسلیوں میں مسکراہٹ نے یکایک کھلبلی سی ڈال دی۔ تانگہ ایک انوکھی ہیئت سے اس کے رُوبرو کھڑا تھا۔ اس کی چھت ——— اُدور سے دیکھنے پر یُوں معلوم ہوتا۔ گویا ایک خشک جھاڑی پر پھٹے پرانے چیتھڑے لٹک رہے ہوں ——! پہیّوں پر ربڑ جگہ جگہ سے غائب تھا۔ تانگے کے بعض شکستہ حصّے کوچوان نے لوہے کے تار سے جکڑ رکھے تھے۔ اس نے سوچا۔ یہ پُرانا تانگہ آج تک تو کسی نہ کسی طرح کام دے ہی رہا تھا۔ لیکن آج کے بعد اس شخص کو ایک نیا تانگہ خریدنا ہوگا۔ جس کی مختلف سطحیں آئینے کی مانند چمک رہی ہوں گی۔ اور جو اس طویل سڑک پر ایک بے نام روانی سے بھاگتا چلا جائیگا۔

اس نے مصر، عراق اور شام میں بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر متعدّد موقعوں پر اپنے انگریز افسروں کو موت کے مُنہ سے نکالا تھا۔ اسے اپنے ولی نعمت کی زندگی کا پُورا پُورا احساس تھا۔ اس کا نمک اس کے روئیں روئیں کی تعمیر میں صرف ہُوا تھا ———

لیکن آج جب ولی نعمت کے زرنگار تخت سے رحمتوں کے نزول کا دن تھا ——— جاں نثاری اور وفاداری کے

صلے میں اس پر بھی ایک بیش بہا خلعت اُتری ——

ولی نعمت نے اس کے سر پر اپنا سایہ ریز ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

اور بے کار جسم ایک بار پھر انہی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ جن پر آج سے چھ برس پہلے بھی وہ اسی تگ و دو میں گھسٹتا رہا تھا۔ ولی نعمت صرف اپنی ضرورت کے مُنہ میں نوالا دینا جانتا تھا۔ اس کی ضرورتیں ختم ہو گئیں اور اب وہ اسے کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ دیرتک فٹ پاتھ پر سر کُٹا رہا۔ اس نے سوچا یہ جسم اس کا نمک خوار نہیں۔ قرضخواہ ہے۔ اسے اپنا قرض وصول کرنا چاہیئے۔

اس کی نگاہوں کے افق پر پرچم لہرائے۔ بھوکی۔ پیاسی اور حلقہ بگوش جنتا کے چیختے چلاّتے ہجوم کا شور سُنائی دیا۔ دھرتی دہلنے لگی، آسمان تھرّایا۔ سُرخ سبز۔ نیلے پیلے۔ سیاہ اور دُوسرے بے شمار جھنڈوں کے پھریرے ہوا کے تموّج پر اُڑنے لگے۔ بادلوں کے اودے لاؤ لشکر جھنڈوں کے پس منظر میں اقامت پذیر تھے۔ خاکے بن رہے تھے، بگڑ رہے تھے، سرسبز پہاڑوں کے سلسلے —— شیر کا مُنہ ——

مگرمچھ کے جبڑے۔ اُونٹ کے ہیولے۔ گاٹے کی تھوتھنی ——
خاکے بنتے رہے۔ نقش سنورتے رہے۔ مختلف النوع رنگوں
کے پھریروں کے اُوپر چند خاکوں کا ایک نقش سنورنے لگا۔
ایک پرچم! آسمان کے بالمقابل جم کر رہ گیا۔ وہ پرچم جسے ان
سب پھریروں نے مل کر تخلیق کیا تھا۔ اس میں رنگ وصورت
کی قید نہیں تھی۔ وہ جھنڈا تھا۔ اِس کا احتجاج مجسم —— اس کی
برسوں کی بھُوک کا ردِ عمل! اس کی غلامی کے جوئے کا توڑ۔
اور اس کی آزادی کا اعلان!

کل تک اس کے پاس اپنی تنخواہ سے بچے ہوئے کچھ آنے
اور اُتنے ہی پیسے تھے۔ اور کل تک اس نے اپنے پیٹ کو
کسی قسم کی آواز اُٹھانے کا موقعہ نہیں دیا تھا۔ کل تک چیختی
ہوئی حیات کو تھپکنے کے لئے اس کے پاس سکوں کی کھنک تھی۔
مگر آج اس کی جیبیں تہ تک ہاتھوں سے پُر تھیں۔ اُنگلیاں جیبوں
میں گول گول خاکے بنانے میں مصروف تھیں اس کے پیٹ
میں خلاؤ کا پھیلاؤ بڑھا۔ اور وہ جگ جگ کا ندیدہ بھر
بھُوک اور اشتہا کا غُل مچانے لگا۔

اس چوک پر وہ بورڈ اب بھی استادہ تھا جو چند برس پیشتر

اس کی بھوک کے آڑے آیا۔ اس کا راہنما ـــــــــ! اس کا محسن! بورڈ کی جانب دیکھتے ہوئے اس کی نگاہوں میں تحسین جھلکی! بورڈ چپ چاپ کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ سرراہ! کسی کی آمد کا منتظر! کس کی آمد کا انتظار ہے اسے؟ وہ سمجھ نہ سکا۔ ہاں! اس کی پیشانی جہاں پہلے راہنمائی کے حروف اُبھر آئے تھے۔ اب صاف تھی۔ دھوپ میں چمکتے ہوئے میدان کی طرح جس میں روئیدگی کے آثار ناپید ہوں! اس کا جی چاہا۔ کہ اپنے محسن دیرینہ سے لپٹ جائے۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں اس سے پُوچھے۔ آج مجھے پھر تمہاری ضرورت ہے۔ تاریکی کی اس بے پناہ تھاہ میں تم مجھے نجات کا کوئی رستہ دکھاؤ ـــــــ مگر بورڈ خاموش تھا ـــــــ اس کی قوت گویائی سلب کر لی گئی تھی۔

سبھی بورڈ اپنی اپنی جگہ پر چُپ تھے ـــــــ خضر گم کردہ راہ ـــــــ کوئی اسے کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ اور اسے بھوک لگ رہی تھی۔ پیٹ پچک رہا تھا۔ انتڑیاں گھُلنے لگ گئیں۔ جیسے خالی معدہ غذا نہ ملنے سے اپنے آس پاس جھانکنے لگ گیا تھا! اُس نے اشتہا کے خیال کو ذہن سے دُور کر دینے کے لئے

تیزی سے بورڈوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔
وہ پیلے رنگ کی ایک کوٹھی کے بیرونی گیٹ پر رُک کر بورڈ پڑھنے لگا۔ "یہاں ڈسچارج شدہ فوجیوں کو روزگار دلوایا جاتا ہے۔" اس کا دل ایک بار زور سے اُچھلا۔ اسے ایک رہنما کی ضرورت تھی۔ اور وہ اس کے سامنے موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں اشتیاق کی چمک نے بھوک کی مُردنی کو دُھندلا دیا۔
وہ قریباً بھاگتا ہُوا کوٹھی میں داخل ہُوا۔
"کون ہو تم؟" اسے بدتمیزی سے بھاگتا ہُوا دیکھ کر چپڑاسی چلّایا۔
"مَیں؟ —— مَیں فوج سے ڈسچارج ہو کر آ رہا ہوں۔" اس کی آواز میں ایک طرح کا وثوق تھا۔ جیسے وہ کون ہوتا ہے۔ اس سے استفسار کرنے والا —— یہ دفتر اسی کی خاطر بنایا گیا ہے۔ اور اسے یہاں آنے کا پُورا پُورا اختیار ہے۔
چپڑاسی کی آنکھوں میں ایک پُراسرار مُسکراہٹ سی چمک اُٹھی۔ اور طنز کا ایک نامکمل نقش۔ جیسے وہ اس کی سادہ لوحی پر قہقہہ لگانا چاہتا ہو۔
"کس سے ملنا چاہتے ہو تم! کوئی چِٹّھی ہے تمہارے پاس!"

"چٹھی کیسی؟ میں صاحب بہادر سے ملنا چاہتا ہوں"۔

"کون سے صاحب بہادر سے؟"

اور وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ کون سے صاحب سے ــــ؟ ــــ اس کے پاس کوئی چٹھی نہیں تھی۔ وہ اس صاحب سے ملنا چاہتا تھا جو اسے ملازمت دے سکتا۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

"مجھے ان صاحب بہادر سے ملنا ہے۔ جو روزگار دلواتے ہیں"۔ اس نے مڑ کر اس بورڈ کی طرف دیکھنا چاہا۔ جس پر اس کی دلپسند عبارت تحریر تھی۔ گویا وہ اسے مدد کے لئے بلانا چاہتا ہو!

اب کے چپڑاسی کا قہقہہ طویل ہو گیا۔!

"تم ہنستے کیوں ہو؟"

"اس لئے کہ مجھے ہنسی آتی ہے ــــ ہاں اس برآمدے سے گزر کر اندر چلے جاؤ۔ سامنے ایک کمرے کے دروازے پر چق ہو گی اجازت لے کر اندر چلے جانا۔ اور ہاں سنو! اگر تمہارا کام بن گیا۔ تو یاروں کا حصّہ دئے بغیر خلاصی نہیں ہو گی"۔

"اطمینان رکھو دوست!" اس نے اپنی جیب میں انگلی سے گول دائرہ بنایا۔ "میں تمہیں ایک روپیہ دوں گا"۔

پندرہ منٹ کے قلیل عرصہ میں وہ جیب میں ہاتھ ٹھونسے

آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا برآمد ہوا اور چپڑاسی کے قریب آکر پھر رُک گیا ۔

"سناؤ دوست! کیا خبر ہے!"

"خبر یہ ہے کہ تمہیں روپیہ نہیں مل سکتا" اس کے لبوں پر زہر خند نمودار ہوا!"

"اب پوچھو میں کیوں ہنسا تھا"۔

"مجھے معلوم ہے"۔

چپڑاسی پھر ہنسنے لگا اور وہ خاموش تھا۔ اس کا چہرہ اڑیل اور سرکش گھوڑے کی سی گہری سیاہی مائل رنگت اختیار کر رہا تھا ۔

"صاحب نے تمہیں کیا جواب دیا؟"

"کہنے لگا۔ تمہاری تعلیم کہاں تک ہے۔ میری تعلیم ابتدائی جماعتوں سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ بچپن ہی میں والدین کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ اس کے بعد جنگ کے شروع ہونے تک ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ دو چار جماعتوں کا سُن کر جیسے اسے کسی پسّو نے کاٹ لیا۔ اوہ ــــ جب تو بڑی مشکل بات ہے۔ خیر تمہارا نام پتہ

درج ہے۔ جب کہیں تمہارے لائق کوئی اسامی خالی ہوئی تمہیں بُلا لیا جائے گا ——— مگر دوست! جب مَیں بھرتی ہونے آیا تھا اس وقت تو ایسی باتیں مجھ سے کِسی نے دریافت نہیں کی تھیں۔ اور اس نے غیر شعوری طور پر پیٹ کو اپنے ہاتھوں کا سہارا دینے کی کوشش کی +

"کیا تکلیف ہے تمہیں" چپڑاسی کی آواز میں شفقت تھی۔ اس کی آنکھوں میں انسانیت کا ایک جذبہ کروٹ لے کر بیدار ہو رہا تھا۔ اس کی نظریں جیسے لگاتار پُوچھ رہی ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم بھُوکے ہو ——— بھُوکا ——— اس کے ہونٹوں پر پپڑی جم گئی تھی۔ اس کا رؤاں رؤاں پکار اُٹھنا چاہتا تھا ——— مَیں نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا۔ کمزوری اور نقاہت سے میری جان نکل رہی ہے۔ پھر غیر شعوری طور پر اس نے اپنی جیب میں اُنگلی سے گول دائرہ بنایا۔ ذہن میں ایک آواز پھیلی "مَیں تمہیں ایک روپیہ دُونگا" اس نے اس نے دانتوں تلے زبان داب لی +

"پیٹ میں خرابی معلوم ہوتی ہے"

"چُورن کھاؤ چُورن"

پچیڑ اسی سے الوداعی علیک سلیک کئے بغیر ہی وُہ اُفتاں و خیزاں کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ "چورن کھاؤ چورن" اس کے چہرے پر ابھی تک زہر خند کا بھیانک کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ کچھ دُور جا کر وہ شیشم کے ایک گھنیرے سائے میں لیٹ رہا۔

دوپہر جل رہی تھی۔ اور یہاں سے شہر کی گنجان آبادی صاف طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ گرمی کی غیر مرئی لہروں سے فضا میں سمندر کے کسی لامحدود پھیلاؤ کا احساس ہونے لگا۔ اس کی آنکھیں مند گئیں۔ اور وہ دوپہر کے سناٹے میں خطرے کے الارم کی ہولناک آواز سُننے لگا۔ آواز! جیسے روشنی کی ان غیر مرئی لہروں کے اس پار گونج رہی تھی۔ کرنیں تپ رہی تھیں۔ شعلوں کا ایک جہنّم ان کے سینے میں چھپا بیٹھا ہے۔ لہریں آہستہ آہستہ ایک بے نام روانی کے ساتھ شہر کی جانب بڑھنے لگ گئی تھیں۔

اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔ بھوک تقریباً مر چکی تھی۔ لیکن پیٹ تک ہاتھ لے جانے میں اسے جو قوت درکار ہوئی۔ اس کا احساس ذہن و قویٰ پر شدید قسم کی کوفت بن کر

چھا گیا! اس نے شہر کے بلند و بالا مکانات پر نگاہ دوڑائی۔ مگر نگاہیں پختہ مکانوں سے اچٹ کر آسمان کی جانب اُٹھ گئیں۔ جہاں ان گنت گدھ چپکے چپکے فضا میں منڈلا رہے تھے۔ صدیوں کی گلی سڑی نعش پر چکّر کاٹ رہے تھے ؛

گدھ فضا میں کیوں اتنی نرمی سے اُڑتے ہیں۔ جیسے کسی غیر محسوس قوت نے ان کے پر و بال سے شباب کی گرمی اچک لی ہو۔ اور کوئی تند بگولہ انہیں آپ سے آپ فضا کے لامحدود پھیلاؤ میں تیرا رہا ہو۔ وہ جھپٹ جھپٹ کر خوراک سے اٹے ہوئے بازاروں کو لوٹ نہیں سکتے —— مگر ہاں —— ! اس نے روشنی کے اس پار کوئی چیخ سُنی تھی۔ خطرے کا الارم! جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اور یہ الارم! —— بازاروں میں اشیائے خوردنی ناپید ہیں۔ جنتا کو شہر میں اناج نہیں مل رہا۔ گلیوں اور کوچوں میں بھوک بال بکھرائے شور مچاتی ہوئی دوڑ رہی ہے۔ بس خوردہ اشیا پر بھوکوں کا جم غفیر مرنے مارنے پر تُل آیا ہے اور گدھ خاموشی سے فضا میں تیر رہے ہیں ؛

وُہ اُٹھا۔ اور درختوں کے سائے میں آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

اس نے چھ سال کے عرصے میں بہادری کی موت مرنے کا آدرش اپنا لیا تھا اسے ایک رہنمائی ضرورت تھی۔ جس کی تلاش وہ مرتے دم تک جاری رکھنا چاہتا تھا۔ پھر یکایک شہر کی مختلف راہوں پر چھوٹے بڑے بے شمار بورڈ اس کی نگاہوں میں تیر گئے۔ ان سب پر سفیدے اور وارنش کی ایک دبیز تہہ چڑھا کر فوجی پراپیگنڈے کا مقصد پورا کرنے والے کارٹون، تصویریں اور الفاظ چھپا دئے گئے تھے۔ یہ بورڈ شہر کے مختلف حصّوں میں اس طرح نصب تھے۔ جیسے یہ اپنی چھ سالہ خدمات کے بعد ابھی تھکے نہیں۔ انہیں کچھ کہنا ہے۔ کچھ اور کہنا ہے۔ وہ اپنی لکڑی کی ٹانگوں پر کھڑے افق کو تک رہے ہیں۔ جہاں کچھ دیر پہلے بموں کے دھماکے سُنائی دے رہے تھے۔ بہادروں کی چیخ پکار۔ بھاری بھرکم اور تباہ کُن مشینوں کی گڑگڑاہٹ۔ ڈوبتے ہوئے جہازوں کے مستول ٹوٹتے ہوئے طیاروں کے ڈھیر —— افق آخری سانس گن رہا تھا۔ کہ دفعتاً بہار کے دن لوٹے۔ کلیاں مُرجھا کر گرنے والی تھیں کہ بڑھاپے کی سلوٹوں میں مُسکراہٹ پھیلی! ہوا چلی! اور یہ مُسکراہٹ جوانی کی تازگی میں منتقل ہونے لگی ÷

پیٹ خالی ہونے کے باعث ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ وہ لڑکھڑا یا۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس اندھیرے میں دیوانہ وار بھٹکنے لگا۔ بورڈ اس کے ارد گرد دُور دُور تک پھیل گئے۔ مگر اب ان کی پیشانیاں دھوئی ہوئی نہیں تھیں۔ ان پر موٹے موٹے الفاظ۔ جلّی حروف اور بے شمار کارٹون اُبھر آئے تھے۔

"ذخیرہ اندوزی بند کرو"۔

"قحط کو روکنے کے لئے کم سے کم خوراک استعمال کرو"۔

"بلیک مارکیٹ کا تدارک کیجئے"۔

"کال کی روک تھام انسانیت کا دھرم ہے"۔

"اسے کچل دو ــــــــ!"

ایک کارٹون اس کے بہت قریب آ چکا تھا۔ قحط کا دیو ــــ! اسے کچل دو! اس کا رہنما پُرزور الفاظ میں اس سے اپیل کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہا۔ کہ تمام تر طاقت سے اسے پیس کر رکھ دے۔

پھر یکایک اس کے احتجاج اور اس کی آزادی کا جھنڈا لہرایا اسے بھوکی جنتا کی چیخیں سُنائی دیں۔ اور گدھ نگاہوں کی سیدھ میں تیرتے ہوئے اتنے قریب چلے آئے۔ کہ اب وہ چھوٹی چھوٹی

ابابیلوں کی جسامت سے بڑھ کر بڑے بڑے ہولناک پرندوں میں تبدیل ہو چکے تھے ؛

گھرر ــــــ گھرر ــــــ گھوں ــــــ وں ــــــ

ں ــــــ بڑے بڑے پُرہول پرند ــــــ تباہ کُن طیارے شہر کی جانب اُڑ رہے تھے۔ بموں کے ہولناک دھماکوں سے کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی ؛

دھڑاپ دھڑاپ مکان گر رہے تھے۔ شہر کی اینٹ سے اینٹ بج رہی تھی۔ اسے محسوس ہُوا۔ کہ ہوا میں اُچھلتی ہوئی مٹی۔ اور ملبے کی گھنی فضا کے پیچھے ایک نیا اور اُجلا شہر تعمیر ہو رہا ہے۔ اس کی نگاہوں میں اشتیاق اُچھل آیا اور وہ اپنی نجات کے جھنڈے کو تھامے طیاروں کو لمحہ بہ لمحہ دُور ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ طیارے، جیسے اس کی اپنی آنکھوں سے نکل کر ان اُونچے اُونچے محلّات کی جانب اُڑ گئے تھے ؛

مثبت و منفی

رات کو بستر پر جاتے ہی رضیہ کو دن بھر کی اُداسی کا سبب معلوم ہو گیا ــــــ کہاں وہ کہ دن رات آپا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور کہاں یہ حالت کہ گھر کاٹنے کو دوڑے۔ وہ سوچنے لگی۔ کیا آپا کو بھی اس کی تنہائی کا احساس ہو سکتا ہے۔ مگر کیوں۔ اسے کسی کی تنہائی کا احساس کیوں ہونے لگا۔ جبکہ اس کی اپنی دُنیا میں سرور و کیف کی محفلیں آراستہ ہیں۔ اسے ایک ساتھی مل چکا ہے۔ ایسا ساتھی جو اسے زندگی کے کھُردرے پن کا احساس بھی نہیں ہونے دے گا۔ زندگی بھر کا رفیق ــــــ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک مُسکراتا ہُوا چہرہ اور لمبا تڑنگا جسم بھرپور انگڑائی کے انداز میں پھیلا۔ اور رضیہ پر کچھ بے بسی سی طاری ہو گئی۔ وہ اپنی اور آپا کی حالت کا مقابلہ کرنے لگی۔ پھر تصور ہی تصور میں آپا کے بیاہ کے پُرشور دنوں کی یاد تازہ

کرنے لگی۔ آپا کی شادی کے دو چار دن جس قدر پُرشور تھے، اُتنے ہی ہمہ گیر بھی تھے، جو آپا کے لئے کچھ وقعت رکھتے تھے یا نہیں۔ مگر اُسے کچھ یقین سا ہو چلا تھا کہ وُہ دن اس کا سرمایۂ حیات ہیں۔ اور اس کی زندگی کا مقام عروج۔ جہاں پہنچ جانے کے بعد اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اس سے اُوپر بھی جا سکے۔ اس سے اُوپر جہاں ہر نوجوان لڑکی زندگی میں ایک مرتبہ جاتی ہے۔ جہاں اسے امرت ملتا ہے۔ تجربوں کی وُہ مٹھاس ملتی ہے جو آئندہ زندگی میں غیر فانی مسرت بن کے رہ جاتی ہے۔

اسے آپا کے بیاہ کا کتنا چاؤ تھا۔ ہر روز اماں سے تاریخ، بیاہ، زیورات، جہیز کے متعلّق عجیب وغریب سوال پُوچھتی اور جب امّاں اس کے سوالات کی بوچھاڑ سے تنگ آجاتی تو وہ آپا کو تاک لیتی۔ اور اس وقت تک اس کا ناک میں دم کئے رکھتی۔ جب تک وہ گھبراہٹ کے مارے چیخ نہ اُٹھتی۔

لیکن اس دن جب —— پُرتکلّف دعوتوں سے مہمانوں کی آؤ بھگت ہوئی۔ بینڈ نے بالکل جدید فلمی گانوں کی مدد سے کر خوب دھما چوکڑی مچائی —— آپا کا ہاتھ کسی اور ہاتھ میں

دے دیا گیا۔ تو اُس کی آنکھوں نے ساون کی جھڑی لگا دی۔ اس کی شوخ طبیعت پر اوس پڑ گئی۔ اور اُسے پہلی مرتبہ احساس ہُوا کہ آپا اس کے لئے کیا تھی۔" آپا کو کتنا حسین ساتھ مِلا ہے۔" رضیہ نے لیٹے لیٹے کروٹ لی اور اپنے بے خواب لمحوں میں شہد ملانے لگی۔ معاً اس کی کم فہمی کی ظلمت سے ایک جانا پہچانا مسکراتا ہُوا خوبصورت چہرہ اور لمبا تڑنگا مضبوط جسم طلوع ہُوا۔ اور وہ سوچنے لگی۔ بھیّا عباس کے پیار میں کتنا خلوص ہوتا ہے۔ وُہ کتنی آزادی سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن ایسے سمے اس سے کوئی جواب بن نہیں آتا۔ وہ گھبرائی ہوئی ہرنی کی مانند پریشان ہو جاتی ہے۔ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر زبان پہ گرہ پڑ جاتی ہے۔ الفاظ کی کم مائیگی جذبات کی شدّت کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اور اس کی یہ مجبوری ندامت میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے — وہ متاسف سی ہو کر پلنگ پر تیزی سے پہلو بدلنے لگی۔ رات لمحہ بہ لمحہ سُنسان ہو رہی تھی۔ دُور کسی گھڑیال نے دو بجا دیئے ؛

رضیہ جانتی تھی کہ آپا اور عباس بارہ بجے ٹرین پر آ رہے ہیں۔ لیکن وہ سر درد کا بہانہ کئے گیارہ بجے تک کمرے سے

برآمد نہ ہوئی۔ ناچار اماں اور بھیا کار لے کر اسٹیشن پر چلے گئے۔

رضیہ نے آپا کی الماریوں پر نگاہ دوڑائی۔ شیشوں میں سے کتابوں کے پُٹھے جھلکیاں دے رہے تھے۔ الماریاں افسانوں اور ناولوں سے بھری پڑی تھیں۔ اسے آپا کی حماقت پر تعجب ہوا۔ آخر آپا نے یہ خرافات کا پلندہ جمع کیوں کر رکھا ہے۔ وہ سوچنے لگی۔ شاعری نری بکواس ہے اور کہانیاں ردّی کا انبار آخر یہ الماریاں فضول ہی کیوں رُکی ہیں۔ رضیہ کی آنکھوں میں لمحہ بہ لمحہ وحشت سی آ رہی تھی۔ اس کے مختلف اعضا میں بالکل غیر ضروری حرکتیں ہو رہی تھیں۔ وہ اُٹھی اور سب کتابیں نکال کر میز پر ڈھیر کر دیں اس کی آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔ چند ایک لمحوں میں اس نے اچھّی بھلی کتابوں کو واقعی ردّی کا انبار بنا دیا، حالانکہ وہ اچھّی طرح جانتی تھی کہ یہ کتابیں آپا کی جان ہیں۔ تاہم اُس نے دیدہ و دانستہ آنے والے واقعات کا مواد خام تیار کیا اور کرسی میں لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی —— سامنے کی دیوار پر آپا کی تصویر چوکھٹے میں مُسکرا مُسکرا کر

اپنی نادان بہن کو تک رہی تھی۔ رضیہ نے اُس کی مُسکراہٹ
کا جواب حقارت آمیز نگاہوں سے دیا۔ اس کے جسم میں پھر
وہی غیر ضروری حرکت لہریں مارنے لگی۔ اسے محسوس ہُوا کہ
یہ تصویر کم از کم اس کمرے میں بالکل غیر ضروری ہے۔ وہ کسی
ارادہ سے اُٹھی۔ عین اسی وقت ڈیوڑھی سے خوشی و مسرت بھری
آوازیں آنے لگیں۔ اور وہ پھر وہیں دھم سے بیٹھ گئی۔ آپا
ماما سے اشتیاق بھرے لہجہ میں پوچھ رہی تھی "بیگم خیریت سے
ہو، رضیہ کہاں ہے؟" اُس کی آواز میں کوئی بلا کا جذبہ طوفان
لا رہا تھا۔ رضیہ کے نفرت و حقارت سے اَٹے ہوئے دل پر
یہ الفاظ تیر کی مانند اُتر گئے۔ پھٹی ہوئی کتابوں کو دیکھ کر
کلیجہ مُنہ کو آ گیا۔ وہ جلدی جلدی انہیں میز کے نیچے چھپانے
لگی۔ مگر آپا رضیہ رضیہ کہتی ہوئی اسے لپٹ گئی۔ اور اس زور
سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا، گویا کوئی غیبی طاقت انہیں دُور
دُور لئے جا رہی تھی۔ آپا رو رہی تھی۔ اس کی ہچکیوں میں
اتنا کرب اور درد تھا کہ رضیہ احساس ندامت سے شل ہو گئی۔
وہ آپا کے کندھے پر مُنہ رکھے چوکھٹے میں سے مُسکرا مُسکرا کر
تکتی ہوئی تصویر سے جیسے معافی مانگنے لگی +

آپا نے دُوسری کُرسی میں بیٹھ کر آنسو پُونچھے۔ رضیہ ابھی تک کھڑی تھی اور سحر زدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی "بیٹھ جاؤ رضا!" آپا نے پیار سے کہا۔ اور رضیہ کے سینے میں پھر طوفان غرانے لگا۔ کیا وہ ابھی تک بچی ہے۔ نادان اور بیوقوف بچی۔ وُہ آپا سے صاف صاف کہہ دینا چاہتی تھی اب وہ رضا نہیں رضیہ ہے۔ معاً آپا کی نگاہیں ردّی کے اس انبار سے ٹکرائیں وُہ تیزی سے پھٹی ہوئی کتابوں کا جائزہ لینے لگی۔ اور پھر چلّا اُٹھی "یہ کیا رضیہ، یہ کتابیں کس نے پھاڑ دیں؟" رضیہ مُجرم کی طرح سر جُھکائے کھڑی تھی۔ اسی وقت عبّاس عروسی سُوٹ پہنے مُسکراتا ہُوا اندر آیا۔ آپا نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "رضیہ"۔ رضیہ نے نیم وا نگاہوں سے عبّاس کی جانب دیکھا۔ آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوئیں۔ جسم میں کمزوری اور نقاہت کے آثار پیدا ہوئے۔ کھڑی کھڑی لڑکھڑائی ——— آپا نے بجلی کی سی تیزی سے اُٹھ کر اسے سنبھال لیا۔ اور گھبرائی ہوئی آواز میں عبّاس کو مخاطب کیا "ڈاکٹر کو فون کیجئے جلدی جلدی"

آپا کا خیال تھا کہ ماں کو پتہ چلنے سے پہلے ہی وہ رضیہ کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھال لے گی۔ لیکن اس کی بیہوشی کی خبر

گھر بھر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ ماں کے تو بوکھلاہٹ کے عالم میں ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اور ایک عرصہ کے لئے اُس کی پٹی سے لگ گئی۔ ڈاکٹر دو وقت آتا۔ قیمتی سے قیمتی انجکشن دیتا۔ لیکن دن رات کی کوششیں بے فائدہ ثابت ہو رہی تھیں۔ کئی بار کچھ ایسی اُفتاد پڑی۔ کہ رضیہ چیخ مار کر بیہوش ہو گئی اور کئی کئی لمحے بے حسّی کے عالم میں سرگرداں نظر آتی۔

ایک وقت آیا جب ڈاکٹر کے مشورہ کے مطابق رضیہ کو ماں اور ایک ماما کے ہمراہ پہاڑی فضاؤں میں بھیج دیا گیا۔ بیماری دائمی صورت اختیار کر رہی تھی۔ لیکن پہاڑی فضاؤں نے اس کی صحت پر خاطر خواہ اثر کیا۔ وہ تکیے کا سہارا لئے بیمنٹ کے جھروکوں میں سے سامنے کی سرسبز وادی کی دلکشی میں جذب ہو جاتی اور کثیف خیالات کی یورش سے نکل کر لطافتوں کی دُنیا میں پہنچ جاتی۔ یک سُوئی کے وُہ دن شاید اس کی زندگی کی نعمتوں کا نچوڑ تھے۔ جذبات کا رُکا رُکا دریا، خواہشات کی موہومی، آرزوؤں کے انجماد نے قلبی نظام کو از سرِ نو مرتّب کر دیا۔ گزرے ہوئے دنوں کی بات تھی کہ اس کے سینے میں خواہشات کے جھکڑ چلتے۔ آرزوؤں کے

طوفان اُمڈتے۔ جن میں سے ایک آدھ کو سمجھنا بھی اس کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ آندھیاں تباہی و بربادی پھیلاتی ہوئی خود ہی تھم گئیں۔ طوفان کا شور و غل خود ہی گہرے سکوت میں تبدیل ہو گیا۔ اور اب اس کے ذہن میں موت کی سی خاموشی اور ہُو کا سا عالم تھا۔ دل پتّھر کا ٹکڑا تھا، جو وحشیانہ دھڑکنے سے نا آشنا تھا۔ لیکن راکھ تلے سُلگنے والی چنگاری پر کوئی طاقت پانی کے چھینٹے نہ دے سکی۔ اس وقت جب عباس کی آمد کا خط پہنچا۔ تو وہ اُچھل پڑی اور مارے خوشی کے زور زور سے چلّانے لگی "امّاں۔ امّاں۔ مجھے کپڑے بدلنے دو۔ میرا نیا سوٹ لاؤ ——— مَیں غسل کروں گی امّاں۔ مَیں یہ منحوس کپڑے اُتار پھینکنا چاہتی ہُوں۔" اُس نے سنگار دان کی جانب دیکھا اور ایک انوکھی مسرّت سے مخمور ہو کر اپنے اُلجھے ہوئے خشک بالوں کو سُلجھاتی ہوئی سنگار دان کی جانب بڑھی۔ لیکن آئینے کے سامنے آتے ہی اس کی مسکراہٹوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ امّاں کو بُلا کر پُوچھنا چاہتی "کیا آئینے میں واقعی میرا ہی عکس ہے۔" اس کی آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کے لئے عباس کا مسکراتا ہُوا چہرہ اور صحت مند جسم گھوم گیا۔

اُس نے سوچا اگر عبّاس اُسے اِس حالت میں دیکھ لے تو... ٹانگوں میں ایک خفیف سی تھرتھری نے جنم لیا۔ دِل کی حرکت میں کوئی رُکاوٹ حایل ہوئی۔ سینے میں کسی خلا نے مُنہ کھولا۔ اِس خلا کو پُر کرنے کے لئے وُہ دوہری ہوتی چلی گئی۔ اور سنگار دان کا سہارا لے کر سر کو آئینے پر ٹکا دیا۔ کافی دیر تک اس کے اعضا میں کوئی جُنبش نہ ہوئی۔ اور جب ماں نے گھبرائی ہوئی آواز میں اُسے بُلایا، تو اُس نے ماں کی جانب امداد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ ماں اسے سہارا دے کر بستر پر لٹانے لگی۔ اور اس کی اُداس دُنیا میں مسرّت کی لہر دَوڑا دینے کے لئے اُسے عباس کی آمد کا پیغام پھر سُنایا۔ دفعتہً رضیہ اس کے ہاتھ سے چھُوٹ گئی۔ اور دھڑام سے بستر پر جا گری۔

جس وقت عبّاس اس کے پلنگ کے قریب کرُسی بچھا کر اس کا حوصلہ بڑھانے لگا۔ تو رضیہ نے بہت قریب سے اس کے مُسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ تو اسے یُوں محسوس ہُوا کہ یہ مُسکراہٹ اس کے چہرے پر ہمیشہ کے لئے جم کر رہ گئی ہے۔ عبّاس اسے برابر تسلّی دے رہا تھا۔ رضیہ تو اب بڑی صحت مند معلوم ہوتی ہے۔ پہاڑ کی آب و ہوا خُوب راس آئی

تمہیں"۔ رضیہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ کچھ کہنے کی کوشش کرتی۔ مگر زبان یاوری نہ کر سکتی۔ ہونٹ محض تھرتھرا کر رہ جاتے۔

اب یہ بستر وستر چھوڑنا ہوگا۔ رضیہ! تم اِن ڈاکٹروں کے مت جاؤ، جو عقل کا جتنا بڑا دشمن ہو اتنا ہی بڑا ڈاکٹر کہلاتا ہے"۔ رضیہ کا سنجیدہ چہرہ یکلخت سُرخ ہو گیا۔ ہنسی کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا۔ اور اس کے بعد وُہ دن بھر ہنستی رہی۔

دُوسرے دن مُنہ اندھیرے ہی رضیہ کی آنکھ کھُل گئی۔ نیند کی بجائے اس کی رگ وپے میں سرور و مستی کی لہریں دَوڑنے لگیں۔ اسے اپنے بالوں پر کسی عجیب سے لمس کا تاثر معلوم ہُوا۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے دیکھا۔ عباس اپنی مخصوص مُسکراہٹ لئے پتلے پتلے اندھیرے میں کسی دُھندلے سے حسین خواب کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔

"رضیہ! مُنہ اندھیرے اُٹھنے کی عادت ڈالو۔ —— سیر کو نہ چلوگی"۔

رضیہ کو یُوں محسوس ہُوا کہ وُہ ایک اچھے بھلے انسان کی مانند طاقتور ہے —— اور جب وہ دونوں مشرق کی

جانب آسمان پر سفید سفید کرنوں کو نُور کا جال تنتے ہوئے دیکھنے لگے تو انہیں ماحول کی لطافت کا احساس ہُوا۔ سُورج آہستہ آہستہ ان پہاڑوں کی پُشت سے بلند ہُوا جن کی گود میں سرسبز وادی پھیل گئی تھی۔ اس وقت سُورج کا رنگ انتہائی طور پر سُرخ تھا جیسے سٹرانشیم کے ایک بہت بڑے کُرے کو آگ لگ رہی ہو۔ عبّاس اپنے دلکش اندازِ گفتگو سے رضیہ کو مسحور کئے جا رہا تھا۔ وہ بات بات پہ ہنس رہی تھی۔ بات بات پر قہقہہ لگا رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وُہ گھُومنے پھرنے کے لئے باہر چلے گئے ÷

سیر کو جانا اُن کا معمول ہو گیا۔ پندرہ منٹ کی سَیر بڑھتے بڑھتے تین گھنٹہ تک پہنچ گئی۔ رضیہ ننّھی منی چٹانوں پر سے کُودتی پھلانگتی تو ایسے معلوم ہوتا جیسے وہ کبھی بیمار ہوئی ہی نہ تھی ÷

ایک دن جبکہ رضیہ کے زندگی اور شباب سے بھرپور قہقہے آس پاس کی سرسبز وادی میں گونج رہے تھے، تو عباس نے ماحول کی دلکشی سے متاثر ہو کر ایک عجیب سی بات کہہ دی۔

"رضیہ! تمھاری آپا کو بھی یہیں نہ لے آئیں؟" رضیہ نے

چونک کر عباس کی جانب دیکھا۔ عباس سنجیدہ تھا ——— رضیہ کی مُسکراہٹوں میں تلخی سی آگئی۔ اور اس کی تشریح طلب نگاہیں خاموشی سے عباس کے چہرے کا طواف کرنے لگیں +

گھر پہنچ کر رضیہ خاموشی سے جھروکے قریب بیٹھ کر ان مناظر کو دیکھنے لگی۔ جہاں وہ عباس کے ساتھ گھومتی رہتی۔ یُوں تو جھروکے میں سے نظر آنے والی وادی ساری کی ساری دلکش تھی ——— مگر وُہ دو چٹانیں جو کچھ فاصلے پر کھڑی ایک دُوسری پر جُھک رہی تھیں۔ اس کے بہت ہی قریب آرہی تھیں۔ ان چٹانوں کو دیکھ کر اسے دو ایسی بہنوں کا خیال آتا جو زندگی بھر کے لئے ایک دُوسری کی رفیق ہوں۔ لیکن اس وقت اسے یُوں محسوس ہُوا ——— کہ وہ ایک دُوسری کے خُون کی پیاسی بہنیں ہیں ——— وُہ ایک دُوسری کا مُنہ نوچ لینے کے لئے جھک رہی ہیں ——— اِس خیال نے اس کے ذہن میں آگ سی بھر دی۔ اور اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں +

عباس نے پریشانی کے عالم میں رضیہ کی جانب دیکھا۔ وہ اب اسے کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ رضیہ تم چُپ چُپ سی ہو؟

"نہ معلوم ــــ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کبھی تندرست نہیں ہو سکتی"!

یکایک عباس کے ذہن میں کُشادگی سی آئی۔ وہ رضیہ کو سمجھ رہا تھا، مگر اسے اس انکشاف سے کوفت ہوئی۔"کیا رضیہ دراصل اس سے محبت کرتی ہے؟" اس کا چہرہ پسینے کے قطروں سے اَٹ رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ کر کہنے لگا۔"یقین جانو رضیہ! تم بالکل تندرست ہو ــــ" پھر اس کی زبان پر گرہ سی پڑ گئی۔ اور خیالات ذہن میں اُبلنے لگے۔ رضیہ کے احساسات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس نے مناسب یہی سمجھا کہ اس وقت اس سے ایسی باتیں کرے جو اسے نا اُمیدی اور شکست کا احساس دلانے کی بجائے اس کے رِستے ہوئے زخم پر پھاہا رکھیں۔ "آئینے میں دیکھو رضیہ، کہ تمہارے ہونٹوں میں کس قدر رس ہے۔ ان میں کس قدر سُرخی ہے۔ تمہارے رُخساروں میں اتنی تازگی ہے اور آنکھوں میں ایسی چمک کہ شاید ہی کہیں نظر آئے۔ تم تندرست ہو۔ بالکل تندرست"! عباس کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسرّت آ گئی۔ رضیہ کشمکش کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں حیرت اور تعجب کا

امتزاج تھا۔ عباس بڑے نرم لہجے میں پوچھنے لگا۔ "رضیہ ایک بات پوچھوں۔ سچ سچ بتاؤ گی۔ دیکھو شرمانا نہیں۔" رضیہ کا دل ایک بار زور سے دھڑکا اور وہ سچ مچ شرما گئی۔ عباس اُس کے چہرے سے اتنا قریب ہو گیا کہ اس کے بال رضیہ کی پیشانی پر تھرتھری پیدا کرنے لگے۔ اور رضیہ نے سر کو اثبات میں جُنبش دی ؛

"تمہیں کسی سے محبّت تو نہیں" رضیہ نے شرما کر اپنا سر گود میں چھُپا لیا۔ "دیکھو تمہارے دل کا راز میرا راز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں کسی نہ کسی طرح تمہارے کام آ سکوں۔" رضیہ کے ذہن میں ہلّڑ سا مچ گیا۔ آپا کا مظلوم چہرہ ایک نکتے کی جسامت سے پھیلا اور آناً فاناً اس کی ساری دُنیا پر حاوی ہو گیا۔ رضیہ نے سر جھٹک دیا۔ "کسی سے نہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ عباس نے اس کا سر اُوپر اُٹھایا۔ "یہ جھُوٹ ہے۔" رضیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ رہی تھیں۔ "یہ جھُوٹ ہے رضیہ! مجھے یقین نہیں آتا"؛

عباس رات بھر خیالات کے ہجوم کا مرکز بنا رہا اور بہت کم سو سکا۔ اِس لئے صبح بہت دیر تک سوتا رہا۔ رضیہ کو عباس سے

کچھ جھجک سی محسوس ہوئی ــــــ کچھ سوچ کر اکیلی ہی کا شغر کو نکل گئی۔ عباس نے سچ کہا تھا کہ وہ بالکل تندرست ہے ــــــ وہ ایک چھوٹی سی چٹان پر چڑھ کر زور سے چیختی۔ اور اپنی صدائے بازگشت سُن کر بہت خوش ہوتی، اور کبھی کُودتی پھلانگتی اِن چٹانوں کی طرف چلی جاتی۔ جو دو بہنوں کی مانند ساتھ ساتھ کھڑی ایک دُوسری پر جُھک رہی تھیں۔ ان کے بیچوں بیچ بھاگنے والے تنگ رستے پر کھڑے ہو کر اُسے بڑا ڈر لگتا۔ وہ سوچنے لگتی۔ یہ دو بہنیں ہیں۔ مگر ان کی زندگی میں کس قدر بُعد ہے۔ ان میں اختلاف ہے۔ ان کے بیچوں بیچ بھاگنے والا تنگ رستہ۔ یہی وہ اختلاف ہے جو انہیں قیامت تک ایک نہیں ہونے دے گا۔

وہ ایک چٹان پر پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اور دیر تک بیٹھی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ تمام عمر یہیں بیٹھے بیٹھے گزار دے۔ بادل برسیں، بجلیاں کڑکیں، دھوپ چمکے، طوفان اور جھکڑ چلیں۔ مگر وہ اِس چٹان کی مانند بے حس ہو جائے۔ وُہ دیر تک اپنے خیالات کی شدت میں کھوئی رہی اور کافی دن چڑھے واپس لوٹ سکی۔

گھر پہنچتے ہی اس کا جی چاہا کہ ماں سے عبّاس کا پوچھے۔ لیکن جب اس نے ماں کو اُترا ہُوا چہرہ لئے اندر آتے دیکھا، تو ایک لمحہ کے لئے الفاظ اس کے ہونٹوں پر جم گئے۔ پھر وہ سوالیہ انداز سے ماں کی جانب دیکھتے ہوئے بولی "کیا بات ہے امّاں؟ عباس بھیّا کہاں ہیں؟"

"اسے کسی ضروری کام سے گھر واپس بُلایا گیا ہے —— وُہ کتنی دیر تمہاری راہ دیکھتا رہا۔ مگر تم نہ جانے کہاں غائب تھیں؟"

"تو پھر وہ چلے گئے؟"

"ہاں۔ ادھر تار آیا۔ اُدھر گاڑی کا وقت ہو رہا تھا، اس لئے" ماں نے اُسے ٹلاتے ہوئے کہا۔ اور چُپکے سے باہر نکل گئی۔

رضیہ سوچنے لگی۔ اماں ضرور کچھ چھپا رہی ہے۔ اُس کے اُترے ہوئے چہرے پر کُشادگی اور ضبط کا صبر آزما کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کی باتوں میں دم گُھٹ جانے کی کیفیت ہے۔ اسے یُوں معلوم ہُوا کہ امّاں نے تار کو ارادۃً اہمیّت نہیں دی —— اس نے یکایک ماما کو آواز دی ——

اسے اندر آتے دیکھ کر پھرتی سے پوچھنے لگی۔ آج گھر سے تار آیا تھا ماما؟"

"یقین جانو بی بی - میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے - تار کا نام سن کر میں پہلے ہی سمجھ گئی - اب خیر نہیں"۔

"کیوں کیا ہوا؟" رضیہ کے سوال میں بے چینی آ گئی۔

"خدا رحم کرے بیچاری کی اٹھتی جوانی پر"۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو - کس کی اٹھتی جوانی پر"۔

"بی بی! تو نہیں جانتی - شہر میں ہیضہ پھوٹ رہا ہے - اور تیری آپا بھی ...... خدا رحم کرے - بیچاری نے ابھی دنیا کا دیکھا ہی کیا ہے؟"

"ہیضہ؟" رضیہ نے زیرِ لب کہا ---- ایک دو تین چار ..... اس کی نگاہیں پورے بارہ مہینے پہلے کا جائزہ لینے لگیں ایک سال پہلے جب اس نے ہیضے کی تباہ کاریوں کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا - انسان پوری قوت سے ہیضے کے خلاف صف آرا تھا - اس کے باوجود گھر گھر سے چیخ و پکار اٹھ رہی تھی - گھر گھر میں صفِ ماتم بچھ رہی تھی - اور اب مستقبل کی جانب غیر معمولی رفتار سے فراٹے بھرنے والا وقت ایک بار پھر

پلٹ کر گزری ہوئی منزلوں کو آواز دے رہا تھا۔ ہیضہ پھر پھوٹ رہا تھا۔ لوگ پھر دھما دھم موت کے منہ میں کودتے جا رہے تھے۔ بچے بوڑھے جوان ——— اور ——— آپا ——— رضیہ خوف کے مارے کانپ گئی۔ اس کے بعد ایک دوسری لہر اُٹھی۔ اور اس کے انگ انگ میں بالکل غیر اختیاری طور پر گدگدی ہوئی۔ اسے اپنے تاریک مستقبل میں دیئے کی مدھم روشنی دکھائی دینے لگی۔ ایک لمحہ کے لئے تو اس نے چاہا کہ دفعتاً اچک کر آسمان کو چھو لے۔ حالانکہ وہ چاہتی یہ تھی کہ آپا کی محروم جوانی اور اس کے حسرتوں سے بھرپور شباب سے متعلق اس کے دل میں ہمدردی پیدا ہو جائے۔ اس کے آنسوؤں میں غرق کر دینے والے انجام سے متاثر ہو کر اس کے ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ جائیں۔ لیکن اس وقت اس کی ذہنی دنیا میں آپ سے آپ کچھ ہوا۔ نہ تو وہ دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا سکی۔ اور نہ آپا کی دردناک حالت پر آنسو لٹانے کی ہمت کر سکی۔ بلکہ اس وقت اس کے انگ انگ میں اس زور سے گدگدی ہوئی کہ اس نے بے اختیار مسکرا دینا چاہا۔

پھر اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا ہوا معلوم ہوا ———

تو اس نے سپٹپٹا کر مُنہ پھیر لیا۔ اور وادی کے سبز دامن پر نگاہ پھیلادی۔ جہاں دو چٹانیں کھڑی تھیں۔ دو بہنیں ......
لیکن اس وقت اُسے محسُوس ہُوا کہ وہ چٹانیں اس کے جذبات کی دو متضاد کیفیتیں ہیں۔ جن کی آہنی گرفت اس پر موت بن کر چھا رہی ہے۔

اتوار کی ایک شام

بلب بھک سے بُجھ گیا۔ اور کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ اس وقت کرم نشاں کو یکلخت ننّھے کا خیال آیا۔ کرم نشاں بوکھلا کر ننّھے پر تقریباً جھپٹ پڑی۔ جو خوف کی شدت سے سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر جب اس نے اندھیرے کی اس ڈراؤنی فضا میں ایک اور انسان نما پنجر کی پُراسرار حرکات دیکھیں۔ تو اس کی چیخیں رُکے ہوئے سیلاب کی مانند خاموشی کے بند توڑ گئیں۔ کرم نشاں خوف اور حیرت سے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

ننّھے کی چیخ پکار سُن کر دایہ بھاگتی ہوئی اندر آئی اور بچے کو پھرتی سے اپنے بازوؤں میں لے کر اسے لوریاں دینے لگی۔ پھر اس نے ارد گرد پھیلے ہوئے اندھیر کے جال میں مدد تلاش کرنے کے لئے بے بس نگاہیں اُلجھا دیں۔ اس وقت کرم نشاں نے

چاہا۔ کہ دایہ کو اپنی موجودگی سے باخبر کر دے۔ مگر اس کے حلق سے کسی قسم کی آواز نکلنے سے پہلے ہی دایہ چیخ اُٹھی ٭ کمرے کا بلب پھر بھک سے بھڑک اُٹھا۔ تاریکی چونک کر مسکراتی ہوئی روشنی میں تبدیل ہوگئی۔ کرم نشاں کا بھوت نما جسم چند اُلجھے اُلجھے اور بے معنی خطوط سے نکل کر ایک مقدس اور قابل تعظیم بوڑھی اماں کے رُوپ میں طلوع ہوا۔ دایہ پھر چلائی "بڑی بی! آپ؟"

ننھا چیخ رہا تھا۔ دایہ صرف اسی قدر الفاظ کرم نشاں کی جانب پھینک سکی "ہمارا خیال تھا بڑی بی! آپ اس اتوار کو نہیں آئیں گی"۔

"ہاں آج زمینوں پر گئی ایک مزارعے آپس میں اُلجھ پڑے انہیں کے جھگڑے چکاتے دیر ہوگئی"۔ کرم نشاں ننھے کو لینے دایہ کی جانب بڑھی۔ ننھا ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر دادی اماں کی جانب متوجہ ہوا۔ پھر جیسے کسی طوفانی دریا کا بند ٹوٹ پڑے۔ وہ دایہ کے سینے سے چمٹ کر چیخ اُٹھا کرم نشاں نے اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اسے پرچانے کی کوشش کی۔ مگر خوف دہراس ننھے پر اس شدت سے چھا گیا تھا۔ کہ وہ

دایہ کے بازوؤں میں تڑپ تڑپ کر ہلکان ہُوا جاتا تھا۔

امت اور فاروق تیز تیز چلتے ہوئے اندر آئے۔ امت نے ننّھے کو دایہ کی آغوش سے چھینتے ہوئے کہا۔ "بیگم! کیا ہُوا ننّھے کو؟"

"اوہ اُمی!" فاروق کرم نشاں کو دیکھ کر چلّایا۔ "آپ آگئیں۔ لیکن یہ ننّھا رو کیوں رہا ہے۔ بیگم؟" بچّے نے ایک نگاہ فاروق کو دیکھا۔ اور بازو پھیلا دئے۔ فاروق نے اسے پچکارتے ہوئے اپنے سینے سے لگا لیا اور بچّہ سسکیاں لے لے کر اُونگنے لگا!

"اسے تم مجھے دے دو!" ننّھا کرم نشاں کی آواز سُن کر چونک پڑا۔ لیکن جب اس کی متلاشی نگاہیں پھر اسی منحنی جسم سے ٹکرائیں تو وہ ایک بار اس زور سے دھاڑا۔ کہ ان سب کے چہرے کسی ناقابلِ فہم احساس کے تحت پیلے پڑ گئے۔ امت نے اُچک کر بچّے کو اپنے ماتا بھرے سینے کی پناہ دی اور کرم نشاں کو ایک پُر اسرار انداز سے تکتی ہوئی دُوسرے کمرے میں چلی گئی۔

فاروق اور دایہ نے بھی بُوڑھی ماں کا قریب قریب امت ہی کے طور سے جائزہ لیا۔ اور سر جھکا کر چُپکے ہو رہے۔

کرم نشاں کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ پسینے کے قطرے بجلی کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ نقاہت سے مجبور ہو کر قریب پڑی ہوئی تپائی پر بیٹھ گئی۔ فاروق اور دایہ آہستہ آہستہ کمرے سے کھسکنے لگے۔ اور کرم نشاں حالات کے موڑ پر گنگ ہو کر رہ گئی +

پھر وُہ تپائی سے اُٹھ کر پلنگ پر چلی گئی۔ اور سُرخ ساٹن کے گول مول تکیے کا سہارا لے کر گھر کے کسی فردِ کی آمد کا اِنتظار کرنے لگی اس کا خیال تھا۔ ابھی فاروق۔ امت ننھے کو اُٹھائے اندر آئیں گے۔ ننھا اسے دیکھ کر چہک اُٹھے گا۔ اور پھر رات گئے۔ اس کی زندگی کے چاند تارے آنکھوں کے سامنے جگمگ جگمگ کرتے رہیں گے +

اس نے ہاتھ بڑھا کر قریب کی کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ چودھویں تاریخ کے طلوع ہوتے ہوئے چاند کی سُنہری کرنیں آسمان پر پھیل گئی تھیں۔ تارے دھوئے دھوئے سے معلوم ہوتے تھے +

اِنتظار کی شدت اور اعصاب کی کمزوری سے مغلوب ہو کر کرم نشاں تھک سی گئی تھی۔ وُہ اپنی آنکھیں بند کر کے

سوچنے لگی "گھر بھر میں مکمّل خاموشی اُور سکوت ہے۔ اس کا انتظار بے سُود ہے۔ وُہ لوگ سو چکے.... سو چکے ہونگے"

پھر یکایک ــــــ اس کی اُمیدوں کے خلاف دایہ کچھ کھانے پینے کی چیزیں ایک ٹرے میں لگا کر لے آئی۔ اور چند ایک بے معنی رُوکھی سُوکھی باتوں کے بعد کمرے سے ہوا ہوگئی۔ جیسے کہہ گئی ہو "بڑی بی! کھاپی کر آرام سے سو رہو۔ آج کی محفل ختم ہوئی"

کرم نشاں نے بند دروازے کو دیکھا جو حالات نے اس کے اور ننھّے کے درمیان کھڑا کر دیا تھا۔ کھانے کو چھوئے بغیر وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔ اور روشن بلب کو شکایت بھرے انداز میں تکنے لگی۔ دیر تک اس کی آنکھوں میں نیند نے ہلکی سی جماہی بھی نہ لی۔ وُہ کروٹیں بدلتی رہی اور پھر بیٹھ کر ارد گرد بے مقصد گھُورنے لگی۔ فرش پر ننھّے کی گیند پڑی تھی! کرم نشاں کی آنکھوں میں ایک ان جانی شفقت اُبھر آئی۔ اس نے لپک کر گیند اُٹھالی اور پھر اسے اپنے ہاتھوں میں دبائے پلنگ پر لیٹ گئی۔ اب اُسے یُوں محسُوس ہُوا۔ کہ اس کی دھڑکن کے ساتھ ساتھ ایک اُور

ننھا اور چھوٹا سا دِل بھی دھڑک رہا ہے۔ اس نے بڑے اطمینان سے آنکھیں بند کرلیں۔ اور خوابوں کی اَن جانی اور اَن بوجھی دُنیا میں اُترتی چلی گئی"۔

صبح اُٹھتے ہی کرم نشاں کو پہلا خیال جو آیا وُہ یہ تھا۔ کہ چائے پر ننھا اسے ضرور مل سکے گا۔ لیکن چائے کا ڈھنگ بھی خلافِ معمول بہت پھیکا رہا۔ اس نے ایک آدھ دفعہ اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ امت کھنچی کھنچی سی تھی۔ اور دایہ برابر ٹال رہی تھی۔ اور جب کرم نشاں کو یہ احساس ہُوا کہ اس کے اپنے چاند تارے اس سے احتراز کر رہے ہیں۔ تو اس کے اعضا پر کپکپی طاری ہوگئی۔ اور اُس کے نازک کندھوں پر فضا ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالنے لگی۔

اس نے رہی سہی قوت کو مجتمع کیا۔ کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر گاڑی تیّار کرائی۔ اور اپنے قصبے کو لَوٹ گئی۔ نصف سے کچھ کم رستہ کرم نشاں نے معاملے کی نوعیت کو سمجھنے میں طے کیا۔ دل ہی دل میں اس نے زمانے سے ہزار ہا شکائتیں کیں۔ اُس منحوس گھڑی کو کوسا جس میں وُہ اِس جانگداز واقعے سے دوچار ہوئی۔ اس کے باوجود اس کی بے چینی میں کسی قسم کی

کمی نہ ہو سکی۔ آخر اُس نے اپنے خیالات کی سنگینی سے راہ فرار اختیار کرنی چاہی۔ تو اس کی نگاہوں میں اپنے قصبے کے سب سے اُونچے مقام پر کھجور کا ایک بلند بالا بُوڑھا درخت دکھائی دیا۔ جو صبح کی دھوپ میں اُداس اُداس دکھائی دیتا تھا۔ اور اس کے قریب مکان کی ایک دیوار کی دُوسری طرف ایک چھوٹے سے درخت کی کونپلیں نظر آ رہی تھیں ؛

اچانک اسے اس دیوار کی منڈیر سے ننھے کے جھانکنے کا شبہ ہُوا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ننھی منھی کونپلیں کھجور کے بُوڑھے درخت کے سائے میں کلیلیں کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں ؛

پھر اُسے گھوڑے کے سموں کے نیچے سے گزرتی ہوئی سڑک کا خیال آیا۔ اتوار کی ہر شام کو یہ سڑک اسی تیزی سے بھاگتی ہوئی تانگے کی مخالف سمت میں نکل جاتی۔ اور یہی سڑک اسے سوموار کی شام کو اپنی زمینوں میں پہنچا دیتی۔ یہ عمل ننھے کی پیدائش کے دن سے شروع ہُوا۔ اور آج پہلا دن تھا۔ کہ کرم نشاں سوموار کی صبح اپنے گاؤں کو واپس ہو رہی تھی ؛

کرم نشاں کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوئی "وہ گاؤں والے کیا سمجھیں گے؟" اس کے دل کا چور جاگا، وہ نہیں چاہتی تھی۔ کہ وہ لوگ اصل حقیقت سے آگاہ ہو جائیں۔ جس ننھے کی کلفات گنوانے اور اُس سے اپنی انتہائی محبت کے اظہار میں وہ دن رات کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتی تھی وہ...... اُسے محسوس ہوا۔ کہ اب بھی ننھا انہیں صفات کا حامل ہے۔ اور اب بھی وہ اپنی دادی کو دیکھ کر کھل جاتا ہے۔ اور اس کی گود میں لوٹنے کے لئے بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔

ننھا بیمار تھا۔ میں اس کی بیماری دیکھ کر ضبط نہیں کر سکتی تھی۔ فاروق اور امرت نے مجھ سے استدعا کی ——— کہ میں واپس چلی جاؤں ——— اور میں ———"

اس کا گلا رُکنے لگا۔ اور آنکھیں آنسوؤں سے چھلک پڑیں۔ جیسے یہ باتیں سوچ سوچ کر اُس نے اپنے زخم خود ہی چھیل لئے ہیں۔ پھر اس نے اپنی تمام تر قوّت ارادی اس امر پر صرف کر دی۔ کہ وہ کسی بات پر غور نہ کر سکے اور اس طرح اپنے آپ کو خوفناک خیالات سے بچا لے۔

تاہم قصبے تک پہنچتے پہنچتے اس نے واقعات کو توڑ موڑ کر خوشگوار صورت دے دی۔ جب وہ اپنے مکان میں داخل ہوئی۔ تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اور حرکات میں شکوہ۔ پلک مارتے محلّے کی عورتوں میں یہ خبر ہوا کی مانند پھیل گئی۔ کہ کرم نشاں آج صبح ہی شہر سے لوٹ آئی ہے عورتیں جمع ہونے لگیں۔ اور تھوڑی ہی دیر میں صحن کھچا کھچ بھر گیا۔

کرم نشاں نے لاکھ کوشش کی کہ طبیعت کو سنبھالا دیئے رکھے۔ اور عادت کے مطابق منّھے کی تعریف و توصیف میں زبان کے جوہر دکھائے۔ مگر اس کی زبان پر مہر سی لگ گئی، وہ خاموش سے ــــــ ٹکر ٹکر ــــــ عورتوں کو فرفر باتیں کرتے ہوئے، ہنستی رہی۔

"کچھ کہو۔ تو بڑی بی؟"

"آخر بات کیا ہے؟"

"ننھا خیریت سے تو تھا؟"

ضبط ٹوٹ گیا۔

"ننّھا بیمار تھا۔ میں اس کی بیماری دیکھ کر ضبط نہیں کر سکتی

تھی۔ فاروق اور امت نے مجھ سے استدعا کی۔ کہ میں واپس چلی جاؤں ——— اور میں ——— کرم نشاں نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی۔

کرم نشاں کا خیال تھا۔ کہ وہ اگلے اتوار اپنی بہو بیٹوں سے ملنے نہیں جائے گی اس طرح اُن لوگوں کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ اور پھر غیر متوقع طور پر فاروق پریشانی کی حالت میں ہانپتا کانپتا یہاں چلا آئیگا۔ اور وُہ! گزرے ہوئے واقعات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہہ دے گی۔ کاشت کی ہوئی زمینوں پر اب کے پھر مزارعین میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں بھلا موقع واردات سے کس طرح غیر حاضر رہ سکتی تھی۔ ہاں میرے ننھے کا کیا حال ہے؟"

"تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔ امی!" فاروق "بہت" پر خوب زور دے گا۔ اور وُہ فرطِ مسرّت میں جھوم جائے گی۔

اتوار آیا ——— اور خشک ویران گزر گیا۔ وُہ دن بھر برآمدے میں کرسی پر نیلگوں آسمان پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی۔ جہاں بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے کچھ کہے سُنے بغیر ——— زمین کے سینے پر لہلہاتے ہوئے پودوں کا منہ چڑا لے

ہُوئے گزُر رہے تھے۔ چیلیں بلندی پر کسی موہوم خیال کی مانند چکّر کاٹ رہی تھیں۔ کبھی کبھار دوپہر کے سناٹے میں کوئی گدھ اپنے شہپروں سے فضا کو روندتا ہُوا گزُر جاتا۔ تو وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی ؛

شام سے پہلے شفق کھلی۔ افق کا چہرہ لالہ زار بن گیا۔ خُون، زندگی، موت، امید۔ حسرت، جمود اور حرکت ——— لیکن یہ بولتے ہوئے رنگین خاکے جلد ہی خاموش ہوگئے۔ اس کے بعد ہر جانب تاریکی چنگھاڑنے لگی ؛

رات کے وقت اڑوس پڑوس کی بیکار اور باتُونی عورتوں نے اُسے پھر گھیر لیا۔ "ننّھے سے ملنے نہیں جا سکیں۔ بڑی بی؟" ——— گرم نشاں نے چاہا کہ چیخیں مار مار کر روئے اور دِل کی بھڑاس نکالے۔ لیکن اُس نے اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کو آنکھوں کی تاریک اور پوشیدہ پناہ گاہوں میں پھر واپس بُلا لیا! اور خاموش رہی۔ اُسے دیکھ کر آنکھوں میں ایک وحشتناک سی کیفیت جھلکنے لگی۔ آس پاس بیٹھی ہوئی عورتیں اُسے دیکھ کر بوکھلا سی گئیں۔ ان کی بلند آوازیں لمحہ بہ لمحہ ڈُوبتی ہوئی سرگوشیوں میں غرق ہوتی چلی گئیں "دیکھ گیا دُکھ ہے

تمہیں بہن ! ـــــ " کرم نشاں خاموش تھی ؛

کرم نشاں کی بیماری کا سُن کر سارا قصبہ اُمنڈ آیا۔ آدھی آدھی رات گئے تک تیمار دار اس کی پٹّی سے لگے ہوئے خلوص بھری باتوں سے اُس کا جی بہلانے کی کوشش کرتے۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح خاموش اور پتھّر کی مانند بے زبان تھی ؛

پھر ایک دن اس کی زبان کو حرکت ہوئی۔ اور یہ حرکت معمول سے بڑھتے بڑھتے ہذیان میں تبدیل ہو گئی ؛

وُہ بار بار ننھے کی مَوت کا ذکر کرتی ؛

کرم نشاں کے تیمار دار ایسی حالت کو ہذیانی کیفیّت کہہ کر ٹال دیتے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کے لئے اِس بات کو نظر انداز کرنا ناممکن سا ہو گیا۔ اور پھر قصبے کے لوگ تیمار داری کے طور پہ نہیں مرحوم کے افسوس کے لئے آنے جانے لگے ؛

تین چار ہفتوں میں کرم نشاں خُشک پیڑ کی مانند بے نُور ہو گئی۔ وُہ پلنگ کے ساتھ چپک سی گئی تھی۔ کہ اچانک اسے اتوار کی ایک شام کو فاروق کا خط ملا ؛

اِس کی آنکھیں بُخار کی حدّت سے جل رہی تھیں لیکن اِس وقت اُن میں ایک عجیب قوّت سمٹ آئی تھی۔ اس کے

کانپتے ہوئے ہاتھ خط کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔

——— ننھا تندرست ہے! لیکن اُمّی جب ڈرائنگ روم میں تمہاری تصویر دیکھتا ہے تو نہ جانے کیوں مچل جاتا ہے۔ اکثر بے معنی باتوں پہ ضد کرنے لگتا ہے۔ کیا تم آج شام کو نہیں آؤ گی۔ ہم سب بے صبری سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

اُس نے مُلازم کو گاڑی تیار کرنے کا حُکم دیا! ور سوچنے لگی۔ آج وُہ کتنی مدّت کے بعد اپنے ننھے کو دیکھنے جا رہی ہے۔ اس اثنا میں وُہ بہت کچھ بدل چکا ہو گا۔ اس کے سامنے کے کئی دانت اب نمایاں ہو چکے ہوں گے۔ ریشمیں اور سنہری بال بڑھ کر اَور بھی نظر فریب ہو چکے ہوں گے ——— وُہ زیرِ لب بڑبڑائی "ننھا.... ننّھا...." شاید وُہ کہنا چاہتی تھی "ننّھا! میرا ننّھا!"

"ننّھا؟" حاضرین میں سرگوشی ہوئی۔ ماما بڑھ کر قریب کھڑی ہو گئی "ہمارا خیال غلط نہیں تو آپ کو خداوند کریم نے ایک اور پوتا دیا ہے۔ ایک اور ننّھا!"

"ننّھا" کرم نشاں نے ایک دو لمحوں کے لئے اپنے ذہن پر زور دیا۔ اور پھر اس کے بُخار کی حدّت سے تمتمائے ہوئے

چہرے پر مسرّتوں کے چمن کھکھلا پڑے۔ اس نے حاضرین کے خیال کی پُرزور تائید کی۔ اِس پر کمرہ مُبارکباد کی صداؤں سے گونجنے لگا ؛

پھر اسے یکایک خیال آیا۔ ابھی تک گاڑی تیّار ہونے کی کوئی اطّلاع نہیں ملی، تو وُہ ماما پر برسنے لگی۔ احباب نے لاکھ سر ٹپکا کہ ابھی تم سفر کے قابل نہیں۔ لیکن اِس پر وُہ کچھ بوکھلا سی گئی۔ چہرے پر ایک انوکھی سی بے چینی بڑھتے بڑھتے گویا بھڑک اُٹھی۔ اس کی آنکھیں پتھرا رہی تھیں۔ اور اعضا میں تشنّج تھا۔ وُہ اپنی تمام تر قوت سے چیخ اُٹھی "ماما!"

اِس وقت چار پانچ احباب آہستہ آہستہ باتیں کرتے اندر داخل ہوئے۔ یکایک کرم نشاں کا دماغ اُبل سا پڑا۔ اور جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اِس طوفان کے بعد یکلخت ایک اٹوٹ خاموشی اور بے پناہ بے حسی کا آغاز ہوا۔ لیکن اُس کے دماغ میں ہنوز وہی شور اور وہی قیامت تھی۔ اس نے بمشکل نگاہیں اُٹھائیں۔ اور نو واردوں کو ایک نظر چُبھتے ہوئے انداز میں دیکھا۔ جیسے وُہ منتظر تھی۔ کہ وُہ لوگ اسے اس سفر سے باز رکھنے کی تگ و دو میں مصروف ہو جائیں گے

اور ان کی خاطر اسے وقت کے چند اور لمحے قربان کرنے پڑ جائیں گے لیکن اس سے پہلے کہ وُہ انہیں کچھ کہے۔ ماما نے اُنہیں بتایا۔ کہ مالکہ کے ہاں ایک اور پوتے نے جنم لیا ہے۔

"ایک پوتا اور؟" وُہ سب ٹھٹک سے گئے۔ کرم نشاں پھر چلّا اُٹھی۔ جیسے وہ کسی کو صُورتِ حالات پر خاموشی سے سوچنے کی فرصت نہیں دینا چاہتی تھی۔

"ہاں ایک اور —— مرنے والے —— ننّھے —— کے بعد ——"

اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک شُعلہ سا دکھائی دیا۔ جیسے اُس کے جسم میں کروٹیں لینے والی سرگرم زندگی کھنچ کر آنکھوں میں چلی آئی ہو۔ وُہ بستر پر لیٹ کر ایک دوبار بے مقصد بڑبڑائی۔ اور چُپکی ہو رہی۔ حاضرین نے خاموشی سے اُٹھ کر کرم نشاں کی نبض تلاش کی —— لیکن ......

اسی فردوس میں!

اسے کمرے کی تنہا اور خاموش دیواریں کاٹنے کو دوڑیں۔ اس کا جی چاہا کہ چھت پر جا کر دھم سے پر شور بازار میں کُود پڑے۔

تنہائی کا یہ زہریلا احساس مہینوں پہلے بھی اس کی رگ رگ میں اُتر چُکا تھا وُہ اس وقت بھی اپنی زندگی کو بے آب گیاہ محسُوس کرتا رہا۔ جب رشید کی تبدیلی کا خواب وخیال بھی نہ تھا۔ اور وُہ دونوں اسی ایک کمرے میں اپنی زندگی کے تلخ لمحات گزُار رہے تھے۔ مگر آج جب کہ رشید تبدیل ہو کر ڈیڑھ بجے کی ٹرین سے ایک دُوسرے مقام کو روانہ ہو چکا تھا۔ ثاقب کی تنہائی حسرت و یاس کی سینکڑوں منزلیں طے کر کے ناقابل برداشت ہو گئی۔

اُس نے پلنگ پر بے قراری سے کروٹ لی۔ اور اپنے

کمرے کے در و دیوار کو بھائیں بھائیں کرتے سُنا! پھر جیسے کسی مرگھٹ میں رات کے وقت شعلوں کی پُر ہول باتیں فضا پر موت کی بے حسی بن کر مسلّط ہو جائیں۔ وُہ اپنی دردناک زندگی کا تصوّر کر کے کانپ اُٹھا۔

وُہ سوچنے لگا۔ ابھی دن ہے۔ آس پاس محلّوں میں شور و شغب اور بازاروں کی آمد و رفت کے منظر سے اپنے وحشت زدہ خیالات کو بہلا سکتا ہے۔ مگر رات کی سیاہ خاموشی میں وہ ستاروں کی طنز بھری مُسکراہٹوں کا مقابلہ کس طرح کرے گا! چاند کے زرد چہرے سے ٹپکنے والے غم فزا تصوّرات کی تاب کیسے لا سکے گا۔

لیکن اِس کے خدشے بہت حد تک بے معنی ثابت ہوئے۔

آج جبکہ وہ کمرے کی چھت پر تنِ تنہا سو رہا تھا۔ اس نے مہینوں کے بعد پہلی مرتبہ ستاروں پر ایک معنی خیز نگاہ پھینکی مشرقی افق قرمزی ہو رہا تھا۔ اور چاند کا ایک کنارہ دُور درختوں کی سیاہ چوٹیوں کے پرے اُبھر چکا تھا!

وُہ اپنی عُمر کی ستائیسویں منزل سے گزر رہا تھا۔ ستائیس سال! اس کی نگاہوں کے سامنے ستائیس سالوں کے کیلنڈر

گھومنے لگے۔ اُن میں اس کی زندگی ہمیشہ ایسی ہی ان جانی دُشوار گزار۔ خشک راہوں پہ گامزن رہی جہاں اُس کا احساس ہمیشہ چیختا رہا۔ زور زور سے چلّاتا رہا۔ اُس نے اپنی زندگی کا رُخ موڑنے میں اپنی تمام تر قوّتیں صرف کر ڈالیں مگر ہر پھر کر اسے اپنے مُقدّر میں جلتے ہوئے صحرا۔ دُشوار گزار پہاڑ اور ظلمت بھرے میدان دکھائی دیئے۔ اور اس نے ایک ایک کر کے عمر کے ستائیس سال اسی بدبختی کی بھینٹ کر دیئے۔

چوبیس پچّیس سال تک اس کے ذہن میں آوارگی تھی۔ اسے اپنی زندگی میں رشتہ داروں کی عدم موجودگی نعمتِ غیر مترقبہ معلوم ہوتی تھی۔ وُہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ اُس کا کوئی سرپرست ہو۔ والدین کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ چکا تھا۔ اور پھر وُہ اپنے پیدائشی مقام اور اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ چھاڑ اتنی دُور چلا آیا تھا۔ کہ رشید جیسے دوست کی ہمراہی میں اُس نے پچھلے دوست احباب تیچے۔ تائے سب بھلا دئے بیس برس کی عمر تک اُسے احساس بھی نہ نہ ہُوا۔ کہ اب وُہ جوانی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اس نے

شادی کا نام اپنے ہم عُمر کلرکوں سے سُنا۔ بھنگن کا روز کا دھرایا ہُوا سوال ”دُلہن کب آئے گی بابو!“ مگر ہر بار اُس نے مُسکرا کر چند ایک بے معنی سے جواب دیئے اور بھول گیا۔ کہ زندگی کے اس دَور میں ہر شخص شادی کر کے گھر بساتا ہے اور پھر ایسی صُورت میں کہ وہ برسر روزگار بھی ہو صحت مند اور خوبصورت بھی!.......

اسے شادی کے نام سے چڑسی ہوگئی تھی۔ اور چھوٹے چھوٹے۔ ننھے منّے بلکتے بسورتے بچّوں سے از حد نفرت۔ وہ کبھی کبھار اپنے ہی محلّہ میں کسی باپ کو بچّوں میں گھرا ہُوا دیکھ پاتا تو اُسے اُس کی مظلومیت پر بہت رحم آتا۔ اور وہ دیر تک اُس کی مخلصی اور نجات کے متعلّق دل ہی دل میں سوچتا رہتا۔ اور پھر یہ سوچ کر کہ وہ خود عُمر بھر مجرّد رہے گا۔ اور شادی کر لینے کی حماقت سے کبھی دوچار نہیں ہوگا۔ اِس خیال کو بھول جانے کی کوشش کرتا +

اس نے ایک بار پھر گہری نظر سے چاند کا جائزہ لیا۔ نیلے نیلے آسمان کی خوبصورت بساط پر ایک خوش قسمت باپ اپنے نٹ کھٹ اور اتراتے ہوئے بچّوں کو محبّت سے

تک رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیا اس کا انجام اُس بد نصیب پھول کا سا ہے۔ جو صحرا میں اُگتا ہے۔ اپنے بچپن اور شباب کو گمنامی کی حالت میں پنپتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور اُسی قصرِ گمنامی میں ہمیشہ کے لئے پھر کھو جاتا ہے۔ اُس پھول کے معرضِ وجود میں آنے نہ آنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ اپنے سماج میں اپنے نام کا ایک نقش بھی باقی نہیں چھوڑ سکتا! اُس کا جی چاہا۔ کہ چادر میں مُنہ چھپا کر بچّوں کی مانند بلکنے لگے۔ یہاں تک کہ اپنی سسکیوں کے درمیان اُسے نیند آجائے۔ اور اپنے تلخ ترین احساسات سے صُبح تک کنارہ کشی اختیار کرنے کے قابل بن جائے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سو جانا چاہا۔

وہ شریف تھا۔ از حد شریف! ایک بچّے کی طرح معصُوم! وہ نہیں جانتا تھا۔ کہ یہ گرہستی کے جھگڑے کیونکر طے ہوتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے رشتہ داروں سے ملنے نہیں گیا۔ اُسے کبھی عورتوں کی پنچایت میں گھرانوں کے حل ہوتے ہوئے بڑے بڑے مسائل سُننے کا موقع نہیں ملا۔ وہ ہمیشہ بُوڑھوں کی سنجیدہ محفلوں سے گریز کرتا رہا۔ اور

اس نے اپنے دوستوں کی ہر اس تجویز کو ٹھکرا دیا۔ جس کا تعلق شادی محبت یا کسی اسی نوع کے مسئلے سے تھا۔

مگر اب وہ عمر کی ستائیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ اس کے ذہن میں جوانی کی سرکشی ماند پڑ چکی تھی۔ اور وہ زندگی کو محض چل چلاؤ سمجھنے کی بجائے ایک ٹھوس حقیقت تصوّر کرنے لگا تھا۔ دن بدن اس کے خیالات میں سنجیدگی عود کر رہی تھی۔ اور وہ شادی کے مسئلے کو ایک مفکّر کے انداز نظر سے دیکھنے کا عادی ہو چلا تھا۔ اُسے اپنی اکیلی اور تنہا زندگی پر افسوس ہونے لگا۔ سماج سے اس نے بغاوت کی تھی۔ لیکن سماج اس کے لئے کتنا ضروری تھا کیا وُہ اپنے بھُولے ہُوئے دیار کو ایک بار پھر لَوٹ سکتا ہے۔

"لیکن نہیں ———"

رات کے اندھیرے میں دُور کوئی پرندہ چیخ اُٹھا! اور پھر اسے اپنے تمام تخیلی محلات منہدم ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ وہ منزل پر پہنچنے کا متمنی تھا۔ مگر وہاں تک پہنچنے کی درمیانی کڑیاں ایک دم غائب تھیں۔ وہ بے بس تھا۔ اور مجبور!

رات کے آخری حصّے میں اُس نے خیالات کے جہنّم سے فرار حاصل کیا۔ رشید بھی آخر اُسی کا ہم عُمر ہے۔ کتنا معصُوم اور ساتھ ہی کتنا نٹ کھٹ۔ وہ بھی شادی اور لڑکیوں کے تعاقب کو اتنا ہی بُرا خیال کرتا ہے۔ وُہ اِس بھرپُور دُنیا میں آزادی کی زندگی بسر کرے گا۔ پلپلے۔ کالے کلوٹے۔ ناک بہتے بچّوں کا چڑیا گھر پالنے کی بجائے۔ کوئی مفید کام کرے گا اینٹوں کا بھٹہ کھول لیگا۔ ٹھیکیداری کا کام شروع کردے گا۔ مگر شادی! یہ اُس کے بس کی بات نہ تھی......

ہَوا کا ایک اطمینان بخش اور رُوح پرور جھونکا آیا۔ ثاقب رت جگے کے باعث اتنی تیزی سے نیند کی آغوش میں پھسلا۔ جیسے وہ سوجانے کے لئے صرف اطمینان ہی کے جھوٹے سچّے سہارے کا متلاشی تھا۔

اس نے کتنے ہی دن رشید کے خط کے انتظار میں زہر کئے۔ اُسے تہدید آمیز خطوط بھی لکھے۔ آج اُس کا جواب پاکر اسے ایک گونہ خوشی محسوس ہوئی۔ لیکن خط پڑھ کر اختلاج سا ہونے لگا۔ اس نے دوبارہ عبارت کے اُس حصّے پر نگاہیں دوڑائیں۔ جہاں رشید اسے ایک نئے انسانی رُوپ اور نئے

چولے میں ملبوس دکھائی دے رہا تھا۔

کرسی پر لیٹ کر وہ سوچنے لگا۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟ وہ خاموش طبیعت۔ معصوم اور انجان سا رشید! جسے اپنے سوا دنیا میں کسی چیز سے رغبت ہی نہیں، اسے محبت ہو رہی ہے اپنے محلّے کی ایک خوبصورت لڑکی سے۔ لڑکی! اور خوبصورت! اس کے بھوکے پیاسے ذہن نے ایک چٹخارا لیا۔ اور وہ خوبصورت لڑکی رشید کو اپنی محبّت کا یقین دلا چکی ہے۔ اس کے دماغ میں خیالات نے اودھم مچا دیا۔ ذہن کسی تیز چکّر کی مانند زور سے گھومنے لگا۔ اور جسم پر ایک ناقابل بیان لرزہ طاری ہو گیا۔

رشید واقعی تبدیل ہو چکا تھا۔ اُس شہر سے اُس شہر کی عادات سے۔ اسے کمرے کے ایک تاریک کونے کا احساس ہوا جہاں رشید کے بلند بانگ نظریئے پڑے سسک رہے تھے۔ چُپکے رو رہے تھے۔

اور اب رشید کے خطوط میں باقاعدگی آ گئی۔ ہفتے میں ایک آدھ خط وصول کر کے ثاقب سوچنے لگتا۔ محبّت نے اس سنگ دل شخص کی دنیا پلٹ دی ہے۔ اُس کی تحریر اُس کے

خیالات اور جذبات میں کس قدر نرمی۔ رومان اور لوچ پیدا ہورہا ہے اِس معصوم اور کمزور سی لڑکی نے ستائیس سال کی ٹھوس اور منجمد چٹان کو پگھلا کر سیّال بنا دیا تھا۔

پھر وہ رشید کی لکھی ہوئی تفصیلات میں کھو کر سوچنے لگتا۔ ان کی مُلاقاتیں کس قدر پُرکیف اور کتنی رومان پرور ہوں گی۔ اُن کی صحبتیں نُور برساتی ہیں۔ اور شاموں کا دلنواز جھٹپٹا سونے کی بارش کرتا ہے۔ وُہ ایک دُوسرے کی محبّت میں اپنے آپ کو۔ دُنیا اور دُنیا کے لوازمات کو فراموش کر چکے ہیں۔

ثاقب کے رُکے ہوئے جذبات میں طُوفان آ رہا تھا اُسے کتنے ہی سال سے اُس کی آمد کا کھٹکا تھا۔ لیکن وہ ہر بار اِس طُوفان کی روک تھام کے لئے برسوں کے تعمیر شُدہ میں ایک نئے بند کا اضافہ کر دیتا۔ اور مطمئن ہو جاتا۔ کہ یہ طوفان اگر اُٹھا۔ تو اِس آہنی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر خود ہی تھم جائے گا۔ وہ برسوں سے اِس کی آمد کا منتظر تھا۔ ایک وحشتناک سی آواز رہ رہ کر اس کے ذہن کی پہنائی میں گونج رہی تھی۔ طُوفان آ رہا تھا۔ مگر ثاقب خاموش رشید کے تازہ خط کو تکتا رہا۔ جو تپائی پر پڑا کھڑکی میں سے آنے والی پوربی ہوا کے جھونکوں

میں تھرک رہا تھا!

رات کو سوتے میں اسے کہیں سے ایک گرج دار آواز سُنائی دیتی۔ تو وُہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ دفتر کے کام میں منہمک اُسے دفعتاً کوئی تیز اور نوکیلی چیخ سُنائی دی جاتی تو وُہ خود بھی گھبرا کر قریب قریب چیخ اُٹھتا! اس کے جسم میں حرارت بڑھ رہی تھی۔ کئی دن سے وہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کی یادداشت میں حیرت انگیز طور پر کمی آگئی۔ آنکھوں تلے اکثر اندھیرا چھایا رہتا۔ اور روشنی کے گول گول دائرے دن کی قبا پر رقص کرتے دکھائی دیتے۔ اُسے ہندسوں کی پہچان میں کافی وقت لگ جاتا۔ دفتر کا معمولی سے معمولی کام بھی اس کے لئے کافی توجہ طلب تھا۔

رشید کے خطوط دفعتاً رُک گئے۔

ثاقب نے گھبرا کر ڈاک کا تانتا باندھ دیا۔ لیکن اِس کی کمزور آواز خاموشی کے اُس صحرا میں ہلکی سی گونج بھی پیدا نہ کرسکی۔

طوُفان کی گرج دُور سے دُور تر ہوتی جارہی تھی۔ ثاقب کو یک گونہ اطمینان بھی ہُوا۔ لیکن اسے جیسے خود ہی

ستائیس سال کے آہنی بند کی آزمائش کی تمنا تھی۔ وہ چند لمحوں کے لئے طوفان کی تندی اور بند کی سختی کو دست و گریباں دیکھنا چاہتا تھا؟

اس کی زندگی پھر اعتدال پر آگئی۔ وہ رشید اور رشید کی محبت کا فسانہ بھول جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو حالات کے تعاقب میں ڈال دیا۔ اور بے حس ہوکر تلخ لمحات گزارنے لگا +

دفتر میں دن بھر کام کرنے کے بعد اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اس نے بے دلی سے گھر کی دہلیز کو پار کرتے ہوئے لیٹر بکس میں ایک سرسری سی نگاہ دوڑائی اور پھر وہ اندر جانے کی بجائے لیٹر بکس پر پل پڑا +

کتنے ہفتوں کے بعد رشید کے قلم میں جنبش ہوئی تھی۔ خط پڑھتے ہوئے ثاقب کی نگاہوں میں بلا کی پھرتی آگئی۔ اور پھر یہ پھرتی حدِ اعتدال سے متجاوز ہو کر گھور اندھیرے میں تبدیل ہوگئی ——— رشید نے شادی کرلی تھی۔ اپنے محلے کی اس خوبصورت لڑکی سے جو اس کی زندگی میں لازوال بہاروں کا جہیز لے کر آئی تھی +

ثاقب کے کانوں میں ایک ناقابل فہم گرج سی سنائی دی۔ یہ گرج بڑھتے بڑھتے فضا میں لاتعداد اور بھیانک آوازیں بن کر مسلّط ہو گئی +

کہیں قریب ہی دم سادھ کر سویا ہوا طوفان زخمی درندے کی مانند دہاڑنے لگا شام کے سائے طویل سے طویل تر ہو گئے۔ اور ثاقب کی نبضیں تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئیں۔ بستر میں بُخار کی حدّت سے کراہتے ہوئے اس نے سوچا۔ آخر اُسے کیا ہو رہا ہے اس کے سینے میں کیوں چند بے معنی سی خواہشات پھڑک رہی ہیں۔ چند جذبے بھُوکے پیاسے رشک اور حسد کے جذبے ——

رات کی خاموشی آوازیں بن کر چیخ رہی تھی! اس نے بُخار اور نقاہت کے باوجود بھی بستر سے نکل کر چارپائی کے آس پاس ٹہلنا شروع کیا۔ رشید معذرت خواہ تھا۔ کہ چند خاص مجبُوریوں کے باعث وُہ اسے شادی سے پہلے نہ تو کوئی اطلاع بہم پُہنچا سکا اور نہ اپنی شادی کی تقریب پر اسے مدعو ہی کر سکا!

اسے رشید پر غُصّہ آنے لگا۔ وُہ مجبوریاں اتنی سنگین

تھیں کیا؟ کہ وُہ اسے ـــــ اپنے ایک عزیز ترین دوست ـــــ کو اتنی آسانی سے نظر انداز کر دینے پر تیّار ہو گیا۔

دوبارہ بستر میں جانے سے پہلے وہ فیصلہ کر چُکا تھا۔ آج ان کی دوستی ہچکیاں لیتی ہوئی دم توڑ دے گی۔ اب وہ قیامت تک ایک دُوسرے کی دوستی کا دم نہیں بھر سکتے۔

ثاقب کی حالت دن بدن بگڑ رہی تھی۔ رشید لکھ رہا تھا۔ اس کی زندگی لمحہ بہ لمحہ سنور رہی ہے۔ اسے اب معلوم ہُوا۔ شادی انسان کے لئے کتنی ضروری ہے۔ دفتر سے پلٹتا ہے۔ تو اس کی بیوی اس کے تھکے ہارے اعضا میں خوشی و مسرّت کی لہر بن کر سما جاتی ہے۔ اور آن کی آن میں دن بھر کی کوفت کو بھُلا کر وُہ کسی ایسی فضا میں اُڑنے لگتا ہے۔ جہاں قوس و قزح کے لطیف مناظر رقص کرتے ہیں۔

بیماری کے ایام آرام اور سکون سے کاٹنے کی غرض سے ثاقب نے ڈیڑھ دو ہفتوں کی رخصت لے لی۔ اور اب دن بھر یا تو ڈاکٹر کی دُکان پہ بیٹھا ہزار ہا امراض کے

شکار مریضوں کے تاثرات کا اندازہ لگانے میں مصروف رہتا اور یا گھر آکر بستر میں دبک رہتا ؛

لیکن دن بھر کی بیکاری اس کے اعصاب پر مُستقل اذیت بن کر سوار ہو گئی۔ اس کے حواس اکثر مختل رہنے لگے۔ اور وُہ سڑکوں پر اس طرح گھُومنے لگا۔ جیسے کسی کھوئی ہوئی شے کی تلاش میں ہو ؛

بابو جی ٹانگہ چاہیئے ..... ٹانگہ

اس کے قریب آکر بولا۔ اور ثاقب کسی قسم کا جواب دیئے بغیر تانگے کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو کر سوچنے لگا۔ اب یہ پُوچھے گا کہاں بابو جی!

"ریل پر جائیں گے۔ بابو جی!" کوچوان کا سوال ثاقب کے ذہن پر چابک بن کر ٹکرایا۔ اس نے غیر اختیاری طور پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ اور پھر وہ سوچنے لگا۔ کہ کیا کرے گا سٹیشن پر جا کر!"

ثاقب ٹکٹ گھر کے قریب تانگے پر سے اُتر پڑا۔ اور ٹکٹ خریدنے کے لئے بھیڑ میں گھُس گیا ——— اور پھر اس نے اس تیزی سے ریلوے کے پُل کو پار کیا۔ اور

پلیٹ فارم پر جا اُترا گاڑی چھوٹنے تک وہ پلیٹ فارم پر ہی ٹہلتا رہا۔ کوئی احساس تھا۔ جو اسے کشاں کشاں رشید کے پاس لئے جا رہا تھا۔ حالانکہ اسے وُہ تا قیامت نہ ملنے کا عہد کر چکا تھا!

اور جب شام کے وقت اس نے رشید کے کوارٹر میں قدم رکھا۔ تو اس کے ذہن میں ایک بار پھر بغاوت لہرائی اس نے چاہا کہ یہیں سے اُلٹے پاؤں واپس بھاگ جائے لیکن پھر وُہ اندر ہی اندر اس کوارٹر کا اندرونی ماحول تعمیر کرنے لگا۔ رشید کتنا خوش قسمت تھا! وُہ اپنے خوش قسمت دوست کی فردِ مس نظر زندگی سے اطمینان اور تسکین اخذ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اپنی رخصت کے باقی ایّام یہیں کاٹے گا۔ اسی جنّت اور اسی فردوس میں!

ایک دو لمحوں کے توقف کے بعد ثاقب نے زنجیر ہلائی۔

"کون ہے" آواز رشید کی تھی۔ ثاقب کے سینے میں انتظار کا ایک وجود ثاقب کے سینے میں انتظار کا ایک وجود ساکت وصامت ہو کر رہ گیا کون ہے۔ بھئی چلے آؤ نا۔ دروازہ کھُلا ہے۔ ثاقب کو ایک لمحہ کے لئے حیرت سی ہوئی۔ لیکن اجازت پا کر وُہ بے خطر

اندر چلا گیا۔ "ارے ثاقب! تم!" رشید چلا اُٹھا۔ اس کی آنکھوں میں دفعتاً ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ شرارت۔ خوشی و مسرّت تعجب۔ اور دُوسرے اَن گنت تاثّرات کا اظہار کرنے والی چمک!

ثاقب..... رشید کو دیکھ کر برآمدے ہی میں رُک گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سے کئی پردے ایک دم اُٹھ گئے۔ اور اس کا سر اس زور سے چکرایا۔ کہ اس نے گھبرا کر برآمدے کے ستون کا سہارا لے لیا ——— !

رشید آستین چڑھائے سامان خورد و نوش کی تیاری میں منہمک تھا ——— ثاقب نے کوارٹر میں ایک مجموعی نگاہ دَوڑائی۔ چھتیں جالے اور دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں گھر کی مختصر اشیاء بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔ اُس نے سوچا اِس کوارٹر نے کم از کم ہفتے بھر سے جھاڑو کی صُورت نہیں دیکھی۔ کیا یہ وہی فردوس ہے...... وہی فردوس!......

تعاقب

فضلو سوچ رہا تھا۔ بخشش؟ اتنی بڑی لیکن کاہے کی؟ پھر یکایک اُسے اپنی حماقت کا احساس ہُوا۔ تو اُس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں ارشد کو ایک اُلٹا سیدھا سلام کیا۔ ارشد صوفے کی آغوش میں سمٹے سمٹے اس کی بدحواسی پر مُسکرایا اور فضلو لڑکھڑاتے ہُوئے قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا اور ارشد سوچنے لگا۔ پانچ روپے کی رقم فضلو کے لئے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن پانچ روپے اِن لاتعداد رقوم کے سامنے کس قدر حقیر ہیں۔ جو اب تک یا تو کُتّوں کی خرید میں تباہ ہو چکی ہیں۔ یا فلش۔ بیئر اور برج کے شوق میں برباد ہو چکی ہیں۔ ارشد کے چہرے پر دفعتاً ایک ہوائی اُڑی۔ وُہ سمجھنا چاہتا تھا۔ کہ وُہ باپ دادا کی کمائی ہوئی دولت کو اتنی بیدردی سے کیوں صرف کر رہا ہے۔ اِدھر کسی اچھی نسل کے کُتّے کی

پیش کش ہوئی۔ اِدھر مُنہ مانگے دام ادا کر دیئے۔ ذرا کسی نے ایک معمولی سے ڈگ کُتّے کی تعریف کر دی۔ طبیعت میں شوق بھر آیا۔ کھڑے کھڑے چیک کاٹا۔ اور کُتّا نوکروں کے سپرد کر دیا؂

پھر اسے یُوں محسوس ہونے لگا۔ کہ بیتے ہوئے دن اور گزُرے ہُوئے واقعات ایک ایک کرکے اس کی نگاہوں کے سامنے تانتا باندھ رہے ہیں۔ وہ اپنے خیالات میں غرق راؔلی براؔدرس کی کوٹھی کے چکر لگانے لگا۔ جو اس کی اپنی کوٹھی کے دائیں ہاتھ کھٹّے میٹھے۔ لیموں۔ چکوترے۔ انگور اور آلُوچے کے درختوں میں دُلہن کی طرح گھری کھڑی تھی۔ اور جہاں اس کی زندگی کا سب سے پہلا اور نامکمّل رومان چُپکے چُپکے رو رہا تھا؂

امیلیا ایک رومان پسند غمگین سی لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک دلکش سی نمی ہوتی۔ بعض اوقات ان آنکھوں میں جھانک لینے سے محسوس ہوتا کہ وہ کہیں خاموشی میں آنسو بہاتی رہی ہے۔ اور اکثر یُوں معلوم دیتا۔ کہ ان آنکھوں سے ابھی آنسوؤں کی دھارا بہ نکلے گی۔

اس کے خدوخال جسم کی مجموعی نفاست۔ تکلّم کا سحر انگیز انداز، طبیعت کی سادگی اسے عام اور لاابالی قسم کی لڑکیوں کی سطح سے اٹھا کر ایک ارفع اور اعلےٰ بلندی پر لے گئی تھی۔ ارشد نے پہلی بار اسے ایک انگلش ہوٹل میں دیکھا۔ جہاں انہیں ایک دوسرے کے پڑوسی ہونے کا علم ہوا۔ وہیں شروع شروع کی رسمی اور پُر تکلف گفتگو کا خاتمہ ہوا۔ اور اس تعارفی رات کا باقی حصّہ انہوں نے بڑی بے تکلفی سے بسر کیا۔ اکٹھے بیٹھ کر ڈنر اڑایا اور پھر ہاتھوں میں ہاتھ دیئے "ہاؤ گرین واز مائی ویلی" کے دوسرے شو کے لئے بھی چلے گئے۔

مسرّت کا ایک احساس تھا۔ جو پانی کی سطح پر پیدا ہونے والے دائرے کی مانند بڑھا۔ اور آناً فاناً ان کی لہریں مارتی ہوئی زندگی کے گرد ہالہ بن کر مسلّط ہوگیا۔ وہ کتنی شدّت سے ایک دوسرے کے منتظر تھے۔ مگر احساسات کے اس شیریں اور دبیز پردے پر تلخی کی ایک لکیر سانپ کی مانند بل کھا رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ امیلیا اس کے سوا اپنی زندگی کا دروازہ کسی اور کو بھی کھٹکھٹانے کا موقعہ دے۔ مگر وہ دیکھ رہا تھا۔ کہ امیلیا وقت کا زیادہ حصّہ اپنے ڈالمشین نسل کے کتّے سے

(جسے وہ پیار سے برپشین کہا کرتی) چہلیں کرنے میں بسر کرتی ہے۔ ایسے کڑے لمحات میں اسے اپنے ارمان خاک و خون میں تڑپتے ہوئے دکھائی دیتے۔ تو وہ بھڑکے ہوئے جذبات سے مجبور ہو کر چاہتا۔ کہ برپشین کو گولی سے اُڑا دے۔ اور اُس روز جب بعض دوستوں کی محفل میں بھی امیلیا نے ارشد کو برپشین کے مقابلے میں ضمنی حیثیت دی۔ تو وہ انتقام کے ایک انوکھے جذبے سے کناروں تک بھر گیا۔ اور اس نے بہت جلد امیلیا کے چند انجان لمحوں کے دوران میں برپشین کو زہر دے کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

ایک معصوم اور بے گناہ موت کے خیال سے ارشد صوفے کی آغوش میں لیٹا لیٹا کانپ اُٹھا۔ وہ اندر ہی اندر اپنی سفاکی پر نادم ہونے لگا۔ مگر اسے زیادہ تر افسوس اِس بات کا تھا۔ کہ برپشین مر کر بھی اس کے لئے ایک مستقل اذیت سے کم ثابت نہ ہُوا۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ برپشین کے بعد امیلیا کی تمام تر توجّہ کا مرکز وہی ہو گا۔ لیکن جب اس کی دفعتاً موت نے امیلیا کا دماغی توازن درہم برہم کر دیا۔ اور وہ ریلی برادرس کی کوٹھی چھوڑ کر یک لخت کہیں چلی گئی۔ تو ارشد اِس خلافِ امید

انجام کی تلخی سے بوکھلا اُٹھا۔

امیلیا کے بغیر کچھ کہے سُنے چلے جانے سے اسے حد درجہ افسوس ہُوا۔ ہر وقت کے بڑھتے ہوئے تلوّن نے اسے مجبور کر دیا۔ کہ وُہ اپنے بیکار لمحات کو فلش۔ برج اور بیئر کے ہاتھوں سونپ دے۔ اس کے علاوہ پریشین ابھی تک اس کے حواس پر سوار تھا۔ جو اسے کٹھ پُتلی کی مانند نچا رہا تھا۔ وہ نسل نسل کا کُتا حاصل کرنے کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہانے لگا۔ نئے نئے مشاغل کی بے پناہ مصروفیت میں اسے یکسوئی حاصل ہوئی۔ تو اس نے رالی برادرس کی کوٹھی میں اُترنے والے نئے کرایہ داروں سے تعلقات بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ اسے اپنی دوستی کا پھیلا ہُوا سِلسلہ بھی ناگوار گزرنے لگا۔

شام کے وقت ارشد ایک سُنسان سڑک کی جانب سیر کو نکلتا تو اس کے اردگرد چھوٹے بڑے کئی کُتّے ہوتے وُہ بازو گھما کر گیند فضا میں اُچھال دیتا۔ تو سب کُتّوں کے جبڑے آسمان کی جانب پھیل جاتے۔ پھر جو کُتا سب سے پہلے لپک کر زیادہ سے زیادہ پھُرتی سے کام لیتا اور گیند دبوچ کر پوری رفتار سے دور موڑ کاٹتی ہوئی سڑک پر

بھاگنے لگتا۔ تو باقی سب اس کا تعاقب کرتے۔ ارشد چیخ چیخ کر انہیں واپس بلاتا۔ خود ان کے ساتھ بھاگتا۔ اور جب شام کے لمبے لمبے تاریک سائے درختوں کی چوٹیوں پر سے اُترتے۔ تو وہ واپس ہونے لگتا۔ اپنی کوٹھی کے قریب پہنچتے پہنچتے اچھا خاصا اندھیرا ہو جاتا۔ اکثر گیٹ کے قریب رالی برادرس کی کوٹھی میں اُترنے والی ایک نئی ہمسایہ لڑکی سے اس کی ملاقات ہوتی۔ جس نے بارہا اِس سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی لیکن ارشد ایک آسیب زدہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ وُہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ اپنی زندگی کو حوادث کے گرداب میں چکر کھانے کے لئے پھر آزاد کر دے ؂

پھر ایک دن اس نے سلمہ کو نہایت ہی خوبصورت کُتے کے ساتھ سڑک پر ٹہلتے دیکھا۔ تو وُہ غیر ارادی طور پر رُک کر اس کی دلچسپ حرکات کا مطالعہ کرنے لگا۔ سلمہ نے موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ "میری گلنار پسند آئی آپ کو؟"

"گلنار؟ —— اوہ ——" وہ جھینپ سا گیا۔ "مجھے ایسے چنچل جانور بہت بھاتے ہیں —— برشین بھی ایسا ہی تھا"۔

ارشد نے بڑی مشکل سے اپنی گرتی ہوئی طبیعت کو سنبھالا۔

"بریشین ——— ؟ ——— بریشین کون ——— ؟"

"مجھے آپ کی گلنار بہت پسند ہے ———"

"——— گلنار میری نہیں ——— میری سہیلی پشپا کی ہے ——— اگر بہت پسند ہو آپ کو۔ تو میں پشپا سے کہہ سکتی ہوں کہ گلنار کہیں کھو گئی ———"

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے سلمہ کی آنکھیں ساڑھی کے زرتار بورڈر پر گڑ گئیں۔ اور ارشد پر دیوانگی سی طاری ہونے لگی۔ اس کے سینے میں نفرت کا ایک بے پناہ جذبہ لہرایا لیکن سلمہ نے اس کے چہرے کے تغیّرات بھانپنے کے لیے جھکی ہوئی نگاہیں اُٹھانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اس کی آواز میں اُمید و بیم کی تھرتھری رقص کر رہی تھی +

"گان وِد دی ونڈ" دیکھا آپ نے۔ غیر معمولی شہرت کا مالک فلم دیکھا آپ نے۔ چلئے میری گاڑی بالکل تیار کھڑی ہے" پھر اس نے اپنی نگاہیں یکلخت ارشد کے حقارت سے اُٹے ہوئے چہرے سے ٹکرا دیں۔ ارشد سلمہ کی بے باک گفتگو پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ مگر جونہی وُہ جھکی جھکی نگاہیں اُٹھیں

وہ ان کے سحر کی تاب نہ لاسکا۔ اور گھبرا کر اسے نظرانداز کرتا ہُوا آگے بڑھ گیا۔ سلمہ شکست خوردہ سی کھڑی کی کھڑی رہ گئی ؛

ارشد نے صوفے میں ایک اور کروٹ لی۔ اب کمرے میں تاریکی کا غُبار حد درجہ دبیز ہو چکا تھا۔ فضلو ڈرتے ڈرتے اندر آیا۔ روشنی کی اور ہمہ تن فدوی بن کر کھڑا ہو گیا۔ ارشد اپنے خیالات کی اُلجھنوں سے ایک اذیت ناک احساس میں نہا کر برآمد ہُوا ؛

"کیا ہے ؟" اور فضلو نے ذرا ہکلا کر کہا ؛

"ایک شخص دیر سے باہر کھڑا ہے۔ کہتا ہے سرکار سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا" ؛

"کہہ دو۔ نہیں مل سکتے" ارشد نے مُختصر سا جواب دے کر پیچھا چھُڑانا چاہا۔ فضلو جہاں کھڑا تھا وہیں جما رہا۔ اس کے ہونٹوں کی کمانیں بید کی مانند تھرا رہی تھیں۔ جیسے ابھی کچھ کہنا باقی ہو ؛

"جاؤ" ارشد نے تحکمانہ لہجے میں کہا ؛

"اس کے پاس ایک کُتا بھی ہے سرکار ——" ارشد

سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"کتّا؟ ـــــ آنے دو ـــــ"

تھوڑی ہی دیر میں ایک دقیانوسی وضع قطع کا آدمی ایک سفید اور جسیم کُتّے کی زنجیر پکڑے اندر داخل ہُوا۔ کتّا ارشد کو دیکھتے ہی غرّا اُٹھا۔ اور ارشد کی اس دیدہ دلیری پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا یکایک ارشد کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی وُہ کُتّے کو بڑے انہماک سے دیکھنے لگا۔ وہی سفید رنگ اور ننھّے ننھّے سیاہ داغ ـــــ جن کی یاد اب بھی اس کے زخمی احساس پر نُور و ظُلمت کے امتزاج کا انوکھا رنگ چڑھا دینے کے لئے کافی تھی ـــــ وہی نکلتا ہُوا قد ـــــ جواب بھی اس کے حواس پر سیماب کی طرح تھرک رہا تھا ـــــ وہی سحر کار آنکھیں ـــــ جو ـــــ

ارشد چیخ اُٹھا۔

"کیا یہ ڈامیشین نسل سے ہے ـــــ"

"آپ نے ٹھیک کہا۔ یہ وہی نایاب نسل ہے۔ مگر اس میں چند ایک خواص ایسے بھی پائے جاتے ہیں۔ جو اس نسل کے دُوسرے کتّوں میں نہیں ـــــ"

وُہ تجربہ کار شخص ارشد کی ہتھیلی گداز کرنے کے لئے اس کے شوق پر یکے بعد دیگرے تازیانے لگانے لگا۔۔۔۔۔۔ "مثلاً یہ کہ بلٹر یا نسل کی مانند بڑی سخت طبیعت کا مالک ہے۔ اپنے حریف کا موت کے دروازے تک ساتھ دیتا ہے ملنے کے موسم کے سوا ایک گھر میں کسی دُوسری کُتّے کی صُورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ گدی کے کُتّوں کی مانند شیر پر حملہ آور ہونے سے نہیں چوکتا۔۔۔۔۔۔ اور گھر میں اس کی یہ حالت ہے۔ کہ چھوٹے چھوٹے بچّوں سے بڑے پیار اور محبّت سے پیش آتا ہے۔۔۔۔۔"

"بولو۔۔۔۔۔۔ کیا قیمت ہے اس کی۔ ارشد کی آواز میں ایک اشتیاق بھری کیفیّت ناچ رہی تھی۔ اس نے جواب کا انتظار کئے بغیر جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ اور بے پروائی سے اس کی گود میں پھینک دی ۔

ارشد نے اِس نئے کُتّے کو بھی برشین ہی کا نام دیا۔ برشین جلد ہی اپنے نئے نام اور نئے آقا سے مانُوس ہو گیا۔ مگر وُہ طبیعت کا اِس قدر غصیلا اور عادات کا اِس قدر جابر نکلا کہ اسے گھر میں کسی دُوسرے کُتّے کی صُورت نظر آجاتی۔ تو ایک خُونخوار درندے کی مانند اس پر جھپٹ پڑتا۔ پہلے پہلے

ارشد کو اس کی اس حرکت سے سخت تکلیف ہوئی۔ اس نے کئی بار اسے سزا دینے کا ارادہ کیا۔ مگر بریشین اس کے سامنے آتا۔ تو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا شاہانہ تاثر پا کر فوراً مرعوب ہو جاتا۔ اس کی چال ڈھال میں حکومت کا خمار لہراتا۔ اور جس وقت ارشد اس سے دوبدو ہوتا۔ تو ایک حقیر سا غلام اور ایک کمزور بے کس محکوم ہو کے رہ جاتا۔

بریشین کی دو ساحر آنکھوں میں ماضی کروٹیں لے رہا تھا — ان میں ایک نظر جھانک لینے سے یوں محسوس ہوتا کہ اس نے ابھی ابھی ایک بہت بڑے جرم کا ارتکاب کر کے امیلیا کی قہقہوں بھری زندگی کو دلخراش سسکیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ارشد محسوس کر رہا تھا کہ اب اس گھر میں بریشین کے علاوہ کسی دوسرے کُتّے کے رکھنے کی گنجائش پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک ایک کر کے سب کُتّے اپنے دوستوں اور خویش و اقارب میں تقسیم کر دیئے۔

آسمان اودے اودے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ارشد برآمدے میں کرسی بچھائے گھاس کے سبز اور ترشے ہوئے تختوں پر نگاہوں کو آوارہ کر رہا تھا۔ ماحول کی شادابی اور

کوٹھی کی بیرونی حد تک پھیلے ہوئے باغ کا سبزہ گھُل مل کر اس کے جُھلسے ہوئے احساس کے لئے دلبستگی کا سامان پیدا کر رہا تھا۔ اچانک اسے گلنار دکھائی دی۔ جو پودوں کو سُونگھ سُونگھ کر تقریباً سرکتی ہوئی اس کی جانب چلی آ رہی تھی۔ ارشد سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اس کے بانکپن کو سراہتا رہا۔ اور دل ہی دل میں اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتا رہا۔ پھر اچانک گلنار کے کان کھڑے ہوئے ——— اور دُوسرے لمحے میں وُہ اس کی نظروں سے غائب ہو گئی۔ ارشد اس کی اس معصوم حرکت پر جی ہی جی میں اظہارِ مسرّت کرتا ہُوا پھر کرسی پر لیٹ گیا۔

بریشین کوٹھی کا چکّر لگاتا ہُوا اس کے قریب آیا۔ اور دُم کو کمالِ مسرّت سے جھلاتے ہوئے اپنا بارُعب چہرہ ارشد کی آغوش میں ملنے لگا۔ ارشد اس کے سپاٹ جسم پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ مگر ان آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب کر بھول گیا۔ کہ ابھی ابھی گلنار اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اور وُہ اس کی خوبصورتی اور نفاست کی کس قدر تعریف کرتا رہا تھا ان آنکھوں کے سامنے ہر چیز ہیچ تھی۔

نیری گلنار اس طرف آئی تھی ابھی ابھی۔ آپ نے۔"

اچانک بریشین ایک بار غرّا کر زور سے اُچھلا۔ ارشد نے پلٹ کر دیکھا۔ بریشین سلمہ پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ سلمہ کا چہرہ مارے خوف کے گیندے کے پھول کی مانند زرد ہو رہا تھا۔ ارشد زور سے چلّایا —— "بریشین" —— بریشین غم و غصّہ کا اظہار کرتے ہوئے رُک تو گیا۔ لیکن سلمہ اس اچانک حملے سے اتنی خوفزدہ ہو گئی۔ کہ لڑھک کر دیوار کے ساتھ جا ٹکرائی اور پھر آہستہ آہستہ پھسلتی ہوئی فرش پر گر پڑی ÷

ارشد بریشین کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیتا ہوا سلمہ کی جانب بڑھا۔ سلمہ خود ہی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اب ارشد خاموش تھا۔ غیر جانب دار اور بالکل بے حس۔ سلمہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی ÷

"بدتمیز" جیسے کہنا چاہتی ہو ÷

—— افسوس اور ندامت کے دو لفظ بھی نہیں ——

ارشد خاموش رہا۔ اور وُہ کسی درخت کی چوٹی پر نگاہیں جمائے کھڑا رہا ÷

"میں پُوچھتی ہُوں، کون شریف آدمی پالتا ہے اِس قسم کے بدتمیز کتّے۔؟"

ارشد نے ذرا چبھتی ہوئی تیز نظروں سے سلمہ کو گھورا جیسے کہنا چاہتا ہو، ایسا ہو گا تمہارے لئے، مجھے یہ قطعاً بدتمیز معلوم نہیں ہوتا"۔

ارشد کو اب بھی خاموش پاکر سلمہ کو تن بدن میں آگ لگ گئی، وُہ تو اس کی زبان سے معذرت کے الفاظ سُننا چاہتی تھی آخر کُتا بھی تو اسی کا تھا۔ "بدتمیز.... بے شرم!.... اب سلمہ نے براہِ راست ارشد کو گالی دی، اور ارشد چیخ اُٹھا "سلمہ مَیں نہیں چاہتا اِس جگہ کھڑی رہ کر تُم اِس طرح کی باتیں کرتی ہی جاؤ"۔

یکایک سلمہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

ایک دن ارشد برآمدے میں ٹہلتے ہوئے اپنی عادات کے حیرت انگیز انقلاب پر غور کر رہا تھا۔ نہ جانے کتنے مہینوں سے اس نے بیر کا گلاس اپنے ہونٹوں سے مس نہیں کیا تھا۔ کتنے عرصہ سے وہ فلش اور برج کے قریب نہیں پھٹکا تھا۔ بریشین کے آنے سے اس کی بے ترتیب دُنیا کس قدر سُلجھ گئی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے ارشد کو خیال آیا۔ کہ ان بدلے ہُوئے حالات سے بریشین کا وہ کس قدر ممنون ہے۔

پھر ارشد کھٹّے کی اس بلند اور گھنی باڑ کی جانب دیکھنے لگا۔ جو سلمہ اور اس کی کوٹھی کے درمیان حائل تھی۔ بریشین باڑ میں سے نکل کر تقریباً لڑکھڑاتا ہوُا اس کے قریب آیا۔ اسے قریب سے دیکھ کر ارشد کی متجسّس نگاہوں میں تعجب تیرنے لگا۔ بریشین کے سفید اور سپاٹ جسم پر بے شمار نیلی اور سیاہ لکیریں اُبھر آئی تھیں۔ ارشد نے گھبراہٹ کی حالت میں فضلو کو آواز دی۔ فضلو بھاگتا ہوُا قریب آیا۔

"فضلو —— فوراً ریلی والی کوٹھی جاؤ۔ اور پتہ لگاؤ بریشین کو سزا کس نے دی ہے۔؟"

"لیکن سرکار —— بریشین کو کون سزا دے سکتا ہے۔ بھلا ایسا خونخوار کتّا —— "مگر اس میں شک نہیں کہ اسے چھڑی سے خوب پیٹا گیا ہے۔ میں نے اسے ریلی والی کوٹھی کی جانب سے آتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ——"

"گلنار کی بُو پا کر گیا ہو گا سرکار —— اب اس کے ملنے کا موسم ہے نا"۔

ارشد نے چونک کر فضلو کی جانب دیکھا۔ جو اپنی چھوٹی چھوٹی تجربہ کار آنکھوں سے بریشین کے جسم کی نیلی دھاریوں کو

غور سے دیکھ رہا تھا۔ ارشد نے دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی داد دی۔

"تو جاؤ ان سے پوچھ کر آؤ ـــــ میرا نام لینا۔"

فضلو تھوڑی ہی دیر میں لوٹ آیا۔

"بی بی سلمہ نے اس دن کا بدلہ لیا ہے۔ سرکار! آج برٹیشین ادھر جا نکلا تو ان کے ملازموں نے اسے خوب پیٹا۔ اور یہ سب بی بی سلمہ کے حکم سے ہوا"۔

"سلمہ نے؟" ارشد کی آواز میں تعجّب تھا۔ "مگر بعد میں انہیں اپنی اس حرکت پر بے حد افسوس ہوا۔ وہ کتنی دیر برٹیشین سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی پیٹھ کو سہلاتی رہیں۔ اور مجھے انہوں نے آپ کے نام ایک پیغام دیا ہے کہ برٹیشین کے ساتھ ایسا سلوک کر کے مجھے بہت دُکھ ہوا ہے آپ سے معذرت چاہتی ہوں"۔

ارشد دیر تک خاموشی میں برٹیشین کے جسم پر ہاتھ پھیرتا رہا جیسے فضلو کی باتوں کو سمجھ رہا ہو۔

ارشد رات بھر اسی سوچ میں غرق رہا۔ کہ امیلیا کی جگہ لینے والی سلمہ سے ایسی ترش کلامی سے وہ کیوں پیش آیا۔ کہ

اس دن اسے رو دینے کے علاوہ کوئی چارہ دکھائی نہ دیا۔۔۔ پھر ارشد کو اپنی کج خلقی پہ افسوس ہونے لگا اور اس کا جی چاہا کہ اسی وقت جا کر سلمہ سے اپنی بے وجہ بدسلوکی کے لئے معذرت کر لے۔

دوسرے دن ارشد بریشین کو ساتھ لے کر ایک لمبی سیر کا عزم باندھ کر نکلا۔ معمول کے مطابق گیند اس کی مٹھی میں موجود تھی۔ مگر اسے آسمان کی جانب پھینکنے کی بجائے وہ اسے بدستور اپنی مٹھی میں مسل مسل کر سوچتا رہا۔ کہ اسے سلمہ سے کتنی نفرت سہی۔ مگر اس کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آنا کسی طرح بھی درست نہیں تھا۔۔۔۔ اس نے اچٹتی ہوئی نظر سے بریشین کی جانب دیکھا جو کان کھڑے کئے تھی۔ ذرا فاصلے پر کسی خاتون کے سفید لباس کو پھڑ پھڑاتے ہوئے غور سے دیکھ رہا تھا۔ بریشین نے ایک دو لمحوں کے لئے توقف کیا اور پھر اچکتا ہوا اس کی جانب ہوا ہو گیا۔

ارشد کے دل میں کھلبلی ہونے لگی۔ سلمہ کے علاوہ اور کون ہو سکتی ہے وہ؟ گلنار اس کے قریب اچک رہی تھی۔ وہ یقیناً سلمہ ہی ہے۔ اور بریشین۔۔۔۔ اس کے حواس پر

سوار رہنے والا پریشین اب سلمہ کے قریب کھڑا پیار سے دُم ہلا رہا تھا۔ ارشد کو یُوں محسوس ہُوا جیسے اس کے سینے پر سے ایک وزنی پتھر اُتر رہا ہو۔ قریب پہنچ کر ارشد نے پہل کی۔ "ہلو مس سلمہ" اور سلمہ نے جُھکی جُھکی خاموش نگاہوں سے ارشد کی عجیب و غریب شخصیت کو دیکھا ارشد نے بغیر سوچے سمجھے کہنا شروع کر دیا۔ "مجھے یقین ہے آپ میرے ناروا سلوک کو بھُول چکی ہوں گی مس سلمہ۔ مجھے اپنے رویّے پر بہت افسوس ہے۔"

سلمہ نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ارشد نے چاہا۔ کہ اس قہقہے کا ساتھ دے۔ لیکن وہ اپنی آواز کے غمگین تاثر کو قہقہے میں تحلیل نہ کر سکا۔ اسے یُوں محسوس ہُوا۔ جیسے اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور اب ایک لمبی سیر — سلمہ اسے بے تعلّقی سے گزرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ ابھی اس کی آنکھوں میں حیرت مکمّل نہ ہوئی تھی کہ ارشد پھر رُک گیا۔ اور ذرا فاصلے پر تجسّس نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ سلمہ نے بھی اس کی نگاہوں کا ساتھ دیا۔ پریشین اور گلنار ایک دُوسرے کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔ ارشد مشین کے

ایک پُرزے کی مانند سلمہ کے قریب سرک آیا۔۔۔

"کیا ہے ۔۔۔۔؟" سلمہ نے اس کی ناقابلِ فہم حرکات سے تنگ آکر کہا۔ ارشد اس کے چڑ جانے سے مُسکرا اُٹھا ۔۔۔۔ "مَیں پُوچھنا چاہتا ہُوں۔ کہ آپ مجھ سے میرا بریشین کیوں چھین رہی ہیں ۔۔۔۔" سلمہ کھوئے ہوئے لہجے میں کہنے لگی ۔۔۔۔ مَیں ۔۔۔۔؟ مَیں کیوں چھیننے لگی آپ کا ۔۔۔۔"

ارشد نے بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا ۔۔۔۔

"کیوں نہیں ۔۔۔۔ واہ ۔۔۔۔ آپ بھی تو عجیب ہیں ۔۔۔" ارشد نے رسٹ واچ کا بغور معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ "ذرا دیکھئے تو وقت! اگر ہم پندرہ منٹ اور لیٹ ہو گئے۔ تو پہلا شو نہیں مل سکے گا۔ ہاں تو کونسی پکچر پسند ہے آپ کو....؟"

گرفت

پھر اُسے احساس ہُوا کہ جب سے وہ تبدیل ہو کر یہاں آیا ہے۔ اس نے گھوم پھر کر اپنے حلقے کے گاؤں تو کیا۔ مکمّل طور پر سارے کاغذات بھی نہیں دیکھے دُوسرے پٹواریوں کی گرداوریاں جہاں قریب الختم ہیں، اِس کا کام ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے۔

اِس کے سارے جسم پر کوتاہی کے اس احساس نے آنچ سی بکھیر دی اور وُہ چارپائی سے اُٹھ کر بیٹھک کی طرف بڑھا بیٹھک کے تالے میں چابی گھماتے ہوئے وہ سوچنے لگا یہ بھی کیا یہ علاقہ جہاں رات کی خاموشیوں میں گیدڑوں کی چیخ پکار سے کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی۔ یہ خُشک سیاہ اور خاموش چٹانیں جو اس کے حلقے کے ایک تہائی حصّے پر قابض ہیں، ان پر چھوٹی جنگلی جھاڑیوں کریر، جنڈ اور ون کے

درختوں کے سوا اور کچھ نہیں پایا جاتا۔ ہاں چند ایک ڈھلوانوں پر مکّی اور باجرے کے چھوٹے چھوٹے قطعے ضرور دکھائی دے جاتے ہیں۔ جہاں ایک بیگھہ کی کاشت سے حوصلہ شکن نتائج برآمد ہوتے ہیں یہاں وُہ کس طرح اپنے اچھّے دنوں کے تسلسل کو جاری رکھ سکے گا۔ یہاں برساتی ڈلیاں ہیں۔ جو آس پاس کے دیہات کو اپنے طوفانی ریلوں سے خس و خاشاک کی طرح بہا دیتی ہیں۔ دیہات اُجڑ اُجڑ کر پھر بستے ہیں۔ حلقے کے میدانی حصّے میں ریگستان کا ایک وسیع سلسلہ نظر آ رہا ہے۔ جِس میں گندم اور چنے کی فصل پیدا کی جاتی ہے ÷

اِس نے تپائی پر پڑے ہوئے رجسٹروں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ قلمدان کھول کر دواتیں درست کیں۔ اور پھر کاغذات کی بے رنگ و بو دُنیا میں ایسا کھویا۔ کہ اسے اپنے تن بدن کا ہوش تک نہ رہا ÷

"سلام عرض ہے سرکار!" رفیق نے خسرہ گرداوری کے پھیلے ہوئے اوراق سے سر اُٹھا کر نووارد حضرات کا ایک ایک کر کے جائزہ لیا۔ پھر قلم کو کانوں میں اٹکا کر کہنے لگا۔

"آؤ! آؤ چودھری! کہو کیسے آنا ہوا ۔"

نور ے نیلی نے کمرے میں نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"پٹواری صاحب! آپ کی بیٹھک جالوں سے کس قدر اٹ رہی ہے۔ حکم ہو تو صاف کر دوں!"

"بھئی اس وقت تو معاف ہی رکھو۔ پھر کسی وقت سہی!"

عمرو بابا چٹائی پر بیٹھنے سے پہلے دو ایک بار کھانسا۔ اور پھر تہبند میں سے تمباکو کی پوٹلی برآمد کرتے ہوئے کہنے لگا کوئی چیتھڑا یا ٹاٹ کا ٹکڑا ہو گا آپ کے پاس؟"

رفیق نے ایک کونے کی جانب اشارہ کر دیا۔ جہاں کسی کھاٹ کا پرانا "مونج" بیکار پڑا تھا۔ عمرو نے آگ بنا کر حقہ گرم کیا اور ایک دو کش لگا کر پھر رفیق کی جانب متوجہ ہوا۔!

"سرکار میں اپنی زمین میں سے ایک بیگھ گل احمد کے پاس بیع کر رہا ہوں۔"

"بیع کر رہے ہو۔ تمہارے پاس دو ہی بیگھے تو باقی ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔"

"جی ہاں۔ سرکار! میری فیروزہ کی شادی ہے نا۔"

"کتنے میں ہو گی بیع ؟"

"تین سو ہیں"۔ عمرو کے گال لٹک پڑے۔

رفیق نے ایک معمولی سا کاغذ اُٹھا کر مزید تفصیل بھی درج کر لی۔ اور ان سب کو یقین دلایا۔ کہ تحصیلدار صاحب اسی ہفتے کو اِس علاقے میں شکار کھیلنے تشریف لا رہے ہیں۔ اسی موقع پر اُن کا انتقال بھی منظور کرا دُوں گا مگر اس کے لئے انہیں بیس روپے بطور فیس ادا کرنے ہوں گے۔ اور اس سے ایک پائی بھی کم نہ ہو گی۔ رفیق کے آخری الفاظ سُن کر بُوڑھے پر کچھ مُردنی سی چھا گئی۔ پھر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تہبند کی دُوسری گرہ کھولی۔! پانچ روپے کا ایک اور روپے روپے کے تین نوٹ گُل احمد کی طرف بڑھا کر کہنے لگا۔

"تم اپنے حصّے کے پندرہ ملا دو۔ اور میرے حصّے کے سات! اصل سے کاٹ لینا"۔

وُہ لوگ روپے گن رہے تھے۔ اور رفیق کا چہرہ پسینے سے اٹ رہا تھا اس نے عمرو پر ایک بھرپور نگاہ دوڑائی۔ یہ بُوڑھا! جس نے برسوں زمین میں ہل چلایا! زمین کے

سنگلاخ سینے کو گداز کر کے کندن نکالا۔ اور بڑی معصومیت سے اسے انسانوں کے جمِ غفیر میں اُچھال دیا۔ یہ بُوڑھا! جس نے اپنی جوانی کے گرم گرم خُون سے سالہا سال فصلوں کو سینچا۔ اور انسانیت کی بقا کے لئے انہیں وقف کر دیا۔ آج جب اس میں اناج کو غذائی قوتوں سے بھر دینے کا راج رخصت ہے۔ تو وُہ کتنی ذلّت سے اپنی زمین کو دولت کے چند حقیر ٹھیکروں کی خاطر بیچ رہا ہے۔ رفیق کو محسوس ہُوا کہ موجودہ نظام نے اس بُڈھے کو دیمک کی مانند کھا لیا ہے۔ کیا وُہ اِس کھوکھلے اور کمزور جسم میں اپنے تیز اور زہریلے ناخُن بھونک دے گا *

عمرو سے اظہار ہمدردی کرتے کرتے اسے دفعتاً ان خُونخوار گدھوں کا خیال آیا۔ جو اس کے جسم سے گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ اس کا جسم کسی بے آسرا مظلوم کی مانند زمین کے طُول و عرض میں بڑی بے رحمی سے گھسیٹا جا رہا تھا۔ بیس روپے ماہوار تنخواہ! سات روپے قحط الاؤنس! اور فرائض کا یہ کوہِ گراں! اس نے ایک نظر اس بڑی الماری کی طرف دیکھا جس میں محکمہ مال کے

ان گنت رجسٹر اس کی کمزور ناچیز شخصیت کا مضحکہ اُڑاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اور پھر ہر دُوسرے تیسرے مہینے کسی افسر کے دَورے پر دس بیس کی فاتحہ! گھر پر چھوٹے بھائیوں اور والدین کی کفالت! بیوی بچّوں کی دن رات کی بڑھتی ہوئی ضروریات! اور بیس روپے تنخواہ جمع سات روپے قحط الاؤنس! دُنیا کا سب سے بڑا کلرک! حکومت کی مشینری کا دار و مدار۔ قلم کی جُنبش سے سارے نظام کو تہ و بالا کر دینے والا ایجنٹ۔

اور یہ تنخواہ!

اس نے ایک لمحہ کے لئے سوچا۔ کہ اسے تُوڑا جا رہا ہے۔ اور تُوٹنے پر مجبور کیا جا رہا ہے وُہ بے بس ہے اور مجبور!

زمینوں کے انتقالات کی فیس وصول کرنا رفیق کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ فیس لگانے میں کسی اصول اور قاعدے کا پابند بھی نہیں تھا۔ تجارت کرنا جانتا تھا۔ انسان دیکھ کر بات کرتا تھا! لیکن جب سے وُہ اس بنجر اور غیر مزروعہ رقبے میں تبدیل ہو کر آیا تھا۔ آج یہ پہلا موقعہ تھا کہ عُمرو بابا کو اپنی لڑکی کی شادی کے لئے زمین فروخت کرنا پڑی۔ اور اتنے دنوں کی خاموشی رفیق کے کانوں میں چاندی کی چھنکار بن کر گونج اُٹھی

آج سے کچھ عرصہ قبل وہ جہاں پٹواری تھا۔ وہ ایک نہری علاقہ تھا۔ سرسبز و شاداب! گاؤں کے گاؤں فوجوں میں بھرتی ہو چکے تھے اور جو باقی تھے ان کی تھوڑی سی محنت بھی کھیتوں میں چاندی اور سونے کے ڈھیر لگا دیتی تھی۔ دیہاتیوں کی یہ فارغ البالی اس کے لئے از حد فائدہ مند ثابت ہوئی۔ لین دین عام تھا۔ وہ ہر شام کو پچاس سے سَو اور کبھی کبھار سَو سے ڈیڑھ سَو تک لے کر اُٹھتا!

اس نے عُمرو کے تیس روپے قبول تو کر لئے تھے۔ لیکن ایسا کرنے سے وُہ دن بھر کے لئے ایک سخت قسم کی ذہنی کوفت سے دوچار ہو گیا۔!

رات کو بستر پر جاتے ہی اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ اور اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ کر اپنی گھوڑی کے متعلّق سوچنے لگا۔ کہ اگر دلاور سنگھ اس کے ساتھ مارچہ کر لے تو کیا ہی اچھّی بات ہے پروا نہیں اگر سَو بیس اسے اور بھی دینے پڑیں۔ رفیق کے ذہن میں ردّ عمل شروع ہوا۔ ایسے کئی کام تھے۔ جو اس نے آج کل کی خاموشی سے مجبور ہو کر پس پُشت ڈال رکھے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے چاہا کہ مہینے بھر میں اگر عُمرو جیسی

دو چار آسامیاں ہی آ جایا کریں۔ تو وہ بڑے اطمینان سے زندگی بسر کر سکے۔ دفعتاً عمرو کے کمزور اور لرزہ براندام لکڑی سے ہاتھ اس کی کم فہمی کی ظلمت سے اجاگر ہوئے۔ اور رفیق کے سارے جسم پر رعشہ بن کر طاری ہو گئے۔

رات ڈھولک کے دھماکوں سے گونج اُٹھی۔ قریب ہی کسی کچّے مکان کی چھت پر لڑکیوں کے قہقہے اُچھل گئے۔ رفیق چونک کر عائشہ کی جانب متوجہ ہُوا۔

"عائشہ؟"

"جی!" عائشہ لیمپ کی روشنی میں ننّھی کا سویٹر بُنتے ہوئے بولی!

"یہ ڈھولک کس کے ہاں بج رہی ہے؟"

"عمرو بابا کے ہاں! اس کی لڑکی کی شادی ہے۔ نا!"

اور پھر رفیق پر ایک کڑی اور مسلسل تنہائی چڑھتی ہوئی گھٹا کی مانند پھیلتی چلی گئی۔ ڈھولک کی آواز۔ نوجوان دیہاتیوں کے گیت۔ اس کے ذہن کے تاریک پس منظر میں چلے گئے۔ اور نگاہوں کے سامنے غمِ زمانہ سے کچلی ہوئی ایک زندہ نعش بار بار اُچھلنے لگی۔ وہ نعش!۔ وہ انجام! جس کی جانب وہ

خود بھی بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اسے بوڑھا عمر اپنے ہی مستقبل کی ایک دردناک اور مسلی ہوئی تصویر نظر آنے لگا۔ پھر یکایک اس کے جذبات اُبل پڑے۔ اس نے لیمپ کی روشنی میں اپنی معصوم بچّی کے پُرسکون مُکھڑے پر نگاہ ڈالی۔ بچّی گہری نیند سو رہی تھی ——— اپنے ماضی و مُستقبل سے بے خبر! ——— وقت کی ایک ہی غیر محسوس پھڑپھڑاہٹ نے اسے ننھّی سی معصوم بچّی کی بجائے اٹھارہ برس کی دوشیزہ کا رُوپ دے دیا۔ جو شرمائی شرمائی، لجائی لجائی دن بھر کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتی۔ اور رفیق اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا۔ کھانستا کھنکھارتا۔ اس کے رشتے کے متعلق غور کرتا۔ یہ فرض بھوت بن کر اس کے ذہن پر سوار تھا۔ وہ ہفتوں اسی غم میں گھُل گھُل کر کھانا پینا۔ اُٹھنا بیٹھنا۔ سب کچھ بھلا چکا تھا!

لڑکیوں کا قہقہہ ایک بار زور سے گونجا! اور رفیق اپنی محویت سے بھٹک نکلا۔ اس نے چند ایک لاشعوری حرکتیں کیں۔ مُنہ پر ہاتھ پھیرا۔ ایک دو بار کھانس کر گلا صاف کیا اور پھر "عائشہ! ایک گلاس پانی! ———"

نہ جانے ——— لڑکیاں رات کے کونسے دور میں

تھک ٹوٹ کر ستاروں کی مانند بکھر گئیں۔ کب ڈھولک کے گلے سے نکلی ہوئی آواز میں سمٹ سمٹا کر پھر اپنے آغاز میں مرکوز ہوگئیں۔ لیکن رفیق کی آنکھ اس وقت کھُلی۔ جب آسمان پر ایک پُر سکون اور رُوح پرور بساط بچھ گئی تھی۔ تارے نہایت صفائی سے چمک رہے تھے۔ اور فضا میں مؤذّن کی آواز گونج رہی تھی۔ اس نے عائشہ کی جانب دیکھا بچّی عائشہ کی باہوں کے حلقے میں ابھی تک اسی معصومیت سے سو رہی تھی۔ دونوں کے چہرے صُبح کے انوار میں نہا دھو کر تاروں کی مانند نکھر گئے تھے۔

ابھی پرندوں نے زندگی سے بھرپور چہکاروں سے صُبح کی آمد کا اعلان نہیں کیا تھا۔ کہ رفیق کی آنکھیں پھر نسیم کی ہلکی ہلکی تھپکیوں سے مندنے لگیں۔ یکایک کہیں قریب سے ایک وحشیانہ دھاڑ اُسے سُنائی دی۔ وُہ بڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اب کئی مِلی جُلی اُلجھی اُلجھی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے بعد ایک دو لمحوں کے لئے وُہ شور و غوغا بلند ہُوا کہ رفیق خوف کے مارے پھر بستر میں دبک گیا!

ننھّی کروٹ بدلتے ہوئے رونے لگی۔ اور عائشہ چونک کر

اسے تھپکنے لگی!

"کیسا شور ہے یہ۔۔؟"

"نہ جانے کیسا۔!" عائشہ کے جاگ اُٹھنے سے رفیق کا ذہن بھی بیدار ہو گیا اور خوف کا وہ تاثر جو ابھی تک اس کے جسم پر لرزہ بن کر چپکا ہوا تھا۔ ڈھل ڈھلا کر خاموش ہو گیا۔ رفیق ایک ہی جست سے سیڑھیوں کی جانب لپکا۔ اور چھت پر جا کر کچھ دیر بعد لوٹ آیا۔

"بیچارے عمرو کے ہاں چوری ہو گئی"۔

عائشہ دھک سے رہ گئی "چوری"!

"ہاں بیچارے نے لڑکی کی شادی کے لئے ابھی کل ہی ایک بیگھہ زمین فروخت کی ہے"۔

"اب کیا کرے گا عمرو بابا!" عائشہ نے دھڑکتے ہوئے دل سے دریافت کیا۔ جیسے اب تنگ دستی کے موت کے سوا اس کا اور کوئی انجام ہو ہی نہیں سکتا۔ رفیق عائشہ کے اس سوال پر چوکنا ہو گیا۔ یہ سوال کس قدر اہمیت رکھتا تھا۔ عمرو کو ضرور کچھ کرنا چاہیئے تھا۔ رفیق کے تحت الشعور میں کچھ کھلبلی سی ہوئی۔ وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس کی کارروائی کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے

وہ پنچایت کے سامنے اپنی مصیبت کا دُکھڑا روئے۔ تھانے اطّلاع کرے۔ گاؤں والوں کو پٹوائے اور پھر حکومت کی وساطت سے گاؤں والوں ہی سے اپنے ہرجانے کی رقم پُوری کرے۔
رفیق کو پھر اُلجھن ہوئی —— اس کے ذہن میں کچھ بات تھی۔ جو وُہ خود جاننے سے گریز کر رہا تھا۔

اسے اپنے خیالات کی آلودگی پر کچھ جھجک سی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھانا شروع کیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ کیا دن رات کی تفاوت کو فراموش کرا دینے والی کام کی زیادتی صرف اس لئے ہے۔ کہ ہم اس معاوضے میں صرف چند ٹکے ماہوار وصول کریں۔ شکوہ و شکایت کا حرف تک زبان پر نہ لائیں۔ پھر اس کی نگاہوں کے سامنے جمعبندیوں کے انبار در انبار لگتے چلے گئے۔ رجسٹر خسرہ گرداوری، رجسٹر انتقالات، لال کتابیں، روزنامچے، اور ہزارہا قسم کے دفاتر اس کی کائنات کے مختصر سے سینے پر پھیلتے چلے گئے۔ اور وُہ ان کے بوجھ تلے اِس قدر دب گیا۔ کہ مارے کوفت کے تقریباً چیخ اُٹھا۔!

لیکن عمرو کی بات کہیں مختلف ہے اس نے سوچا! عمرو!

اس کے اپنے بڑھاپے کی علامت! اسے اس بوڑھے سے دوبارہ وہی سلوک نہیں کرنا چاہیئے۔

اب اچھا خاصہ دن نکل آیا تھا۔ ہمسایہ میں تیلیوں کے ہاں کولھو کے چلنے کی آواز متواتر آ رہی تھی۔ اور بیل کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹی برابر ٹن ٹن کئے جا رہی تھی۔ رفیق بستر پر سے اُٹھا اور ننھی کو بازوؤں میں لے کر اس کی معصوم پیشانی پر دو تین گرم گرم بوسے جڑ دیئے وُہ دن رفیق نے بڑی بے چینی سے کاٹا۔ اسے بارہا خیال آیا۔ کہ اپنے جالوں سے اٹے ہوئے کمرے کی صفائی کر دے۔ لیکن مصلحت تھی جو اس کے اعضا پر سُستی اور کاہلی بن کر چھائی رہی۔ اور وُہ سہ پہر تک پس و پیش کا نشانہ بنتا رہا۔ پھر دفعتہً اسے کچھ خیال آیا۔ وُہ اُٹھ کر خود بخود کمرہ صاف کرنے لگا۔ بانس کے ایک سرے پر چیتھڑے باندھ کر جالے صاف کرنے میں مصروف ہو گیا۔

یہ الماری عرصہ سے اسی طرح بند تھی۔ قریب پہنچ کر اس نے جالے اُتارنے والا بانس دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ اور الماری کے پٹ کھولے، مچھروں کی ایک ناگہانی

بوچھاڑ اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے اپنا چہرہ دونوں باہنوں کی محراب میں چھپا لیا۔

الماری بندوبست اراضیات سے بھی پہلے کے حنائی کاغذات سے بھری پڑی تھی۔ برسوں سے اوپر تلے رکھے ہوئے کرم خوردہ کاغذوں میں سے گھہک کے بھبکارے اُٹھ رہے تھے۔ ایسی گھہک جو مرگھٹ میں مُردوں کے جلنے سے لمحہ بہ لمحہ فضا پر مسلّط ہوتی جا رہی ہو۔

اِس وقت عُمرو بابا۔ گل احمد اور نُورا اچانک بیٹھک میں داخل ہوئے اور رفیق کو اپنے ہاتھوں سے صفائی کرتے دیکھ کر شکایت اور افسوس کا اظہار کرنے لگے انہیں غیر متوقع طور پر اندر آتے دیکھ کر رفیق بوکھلا گیا۔

"صبح سے کسی کام کو جی نہیں چاہا۔ اب سوچا۔ لگے ہاتھ کمرے کی صفائی ہو جائے۔ مگر عمرو بابا! کچھ معلوم ہے تمہیں یہ چوری کس کے ایما پر ہوئی آخر۔!"

عُمرو غم اور افسوس کے مارے مُرجھا کر رہ گیا تھا۔

"ہونی تھی ہو گئی سرکار! اب شکوہ سے کیا حاصل! لے دے کے ایک بیگھہ باقی تھا۔ آج وہ بھی تین تیئو کے

بدلے فروخت کرتا ہوں۔ فیروزہ کے بسنے کی سبیل نکل آئی تو سمجھوں گا۔ مجھے زندگی بھر کی تکلیفوں کی قیمت وصول ہو گئی؟"

عمرو کی آواز میں کسی محبت بھرے دُکھی باپ کی چیخ تھی۔ جو رفیق کے جگر میں اُتر کر کسی نوکیلی شے کی مانند ترازو ہو گئی۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ اسے اس بُوڑھے سے کس قدر ہمدردی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وُہ اس بے آسرا بُڑھاپے کو اپنے طاقتور بازوؤں کو سہارا دے۔ پھر اس نے ارادہ کر لیا۔ کہ جہاں تک ہو سکا۔ وہ ہر موقعہ پر اسے اپنا قلم اپنا بازو پیش کرے گا۔ ہر ممکن طریق سے اس بے یار و مدد انسان کی خدمت کرے گا۔

اب کے سرکار! حقیر سا نذرانہ لایا ہوں۔ اسے قبول کیجئے۔ آپ اسے ایک غریب اور مُفلس کسان کے ہزاروں اور لاکھوں سمجھ کر قبول فرمائیے مجھے نا امید نہ کیجئے سرکار!"

اس نے عمرو کی حالتِ زار پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے روپے جیب میں رکھ لئے اور عمرو سے پُورے تیس روپوں کا مطالبہ بالکل نہ کیا۔ عمرو بابا لاکھ لاکھ دُعائیں دیتا ہُوا رخصت ہُوا۔ رفیق نے چاہا کچھ دیر اور اسے اپنے پاس ٹھرائے

رکھے - اپنا دل چیر کر اس کے سامنے رکھ دے۔ اور کہے "بابا! عمرو بابا! مجھے تم سے کس قدر ہمدردی ہے"۔

رفیق الماری کی جانب بڑھا! بساندھ کا ایک بگولہ اُٹھا۔ اور اس کا سر چکرا گیا۔ اسے الماری کو صاف کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کمرہ جالوں سے اٹ رہا تھا۔ الماری کے وسطی خانے میں جالوں نے اندھیر مچا رکھا تھا۔

پھر نہ جانے ایک مکھی اندھا دھند اُڑتی ہوئی کہاں سے ٹپکی۔ جالے کے تاروں میں پھنس کر تڑپی اُچھلی، رفیق کو محسوس ہوا۔ کہ وُہ تاریں جو بظاہر نہایت نرم اور خوبصورت معلوم ہوتی ہیں ریشم کی رسیّوں کی مانند سخت اور بیرحم ہیں۔

چور

ہر ہفتے کوئی نہ کوئی دوست اسے ایک لمبا چوڑا خط لکھ بھیجتا۔ جس میں بڑی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اس کا خاکہ اُڑایا ہوتا۔ اور پھر اپنی نئی ترقیوں اور پروموشنوں کا ذکر کرتے ہوئے اسے بھی کہیں ٹِک جانے کا مشورہ دیا ہوتا۔ اس کے تقریباً ہر دوست کی تان اسی قیمتی مشورے پر آکر ٹوٹتی۔ اور وہ کرسی پر بیٹھا بیٹھا ایک بار تو غصے اور گرمی کی شدت سے بَل کھا اُٹھتا اور خط اس کے ہاتھوں میں چُرمُر ہو کر رہ جاتا۔

"بابو جی۔ آپ کا خط!"

مجید نے چونک کر پوسٹ مین کی جانب دیکھا۔ اور پھر اچک کر اس کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔ دوستوں کے چہرے ایک بار رُوم سے اس کے ذہن میں گھوم گئے۔ نگاہیں لفافے کے

بائیں ہاتھ والے نچلے کونے پر آکر ٹھہریں......

اس نے ایک ہی سانس میں خط شروع سے آخر تک پڑھ لیا۔ تعجب اور مسرت کے وہ دیئے جو اس کے چہرے پر بھک سے بھڑک اُٹھے تھے۔ آہستہ آہستہ مدھم ہوتے ہوئے پھر اس کی بے چینی میں غوطہ لگا گئے۔

"پھر پروموشن" اس نے خط کو ہاتھوں میں مسلنا شروع کیا —— پھر پروموشن۔

تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ سلیم نے بی اے کر کے چند ایک سفارشیں فراہم کیں۔ اور سی آئی ڈی کے محکمہ میں کسی اعلےٰ عہدے پر فائز ہو گیا۔ مگر یہ کیا مذاق ——"

مجید سٹپٹا کر سوچنے لگا" کہ ابھی میاں نے جا کر چارج بھی نہیں سنبھالا۔ اور چھوٹتے ہی پروموشن ——!"

لیکن جونہی جھنجھلاہٹ کا یہ غبارہ اس کے ذہن سے دور ہوا۔ تو وہ حالات کو نہایت سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے سوچنے لگا۔ سلیم کا آخری مشورہ جو اس کی فکر و نظر کے لئے اچھا خاصا حکم رکھتا تھا۔ اسے بہت پسند آ رہا تھا۔ سلیم اسے بھی محکمہ سی آئی ڈی میں درخواست دینے کی ترغیب دے رہا تھا

لیکن اس مشورے میں خلوص کی بو تھی۔ جسے بہت مدت کے بعد پہلی دفعہ محسوس کر کے وُہ کانپ اُٹھا۔ اسے یُوں محسوس ہُوا۔ کہ اس کی بے حس اور رُکی ہوئی زندگی کی باگوں کو ڈھیل دے دی گئی ہے۔ اور اب وُہ آسمانوں کی بیکراں وُسعتوں کو وقت کی تیزی سے طے کر سکتا ہے۔ کاش یہی مشورہ اسے کسی نے چند سال پہلے دیا ہوتا۔ تو آج وُہ بھی کسی مرتبے کو پہنچ چُکا ہوتا ــــــ پھر اسے اپنی بے جان اور نقاہت کے مارے رُک رُک کر چلتی ہوئی تقدیر پر افسوس ہونے لگا۔

اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹا۔ تو وُہ سی آئی ڈی۔ کی روزمرّہ کی دلچسپیوں میں گھُومنے لگا۔ رازہائے سربستہ کا انکشاف۔ تفتیش میں نئے نئے حادثات۔ رُعب داب۔ روپیہ پیسہ۔ وُہ اَن دیکھے مناظر اس کی دلچسپی کے دامن کو پھیلا کر کائنات کے ایک سرے سے لے کر دُوسرے کنارے تک بھاگتے چلے گئے تھے۔ اس کے سینے میں خواہشات کا رُکا رُکا دریا کسی کوہ پیکر بند کو توڑ کر دُور دُور دیک پھیل رہا تھا۔

اس نے کوٹ کی اندرونی جیب کو ٹٹول کر پن نکالا۔ اور میز پر سے پیڈ اُٹھا کر محکمہ سی آئی ڈی میں بھیجنے کی

درخواست کا کچّا مسوّدہ تیار کیا۔ پھر اسے ٹائپ کرانے کی غرض سے کوٹ کی بیرونی جیب میں محفوظ کرتا ہُوا اپنی کامیابی اور شکست کے خیالات میں کھو گیا ٭

وہ اپنی ان ضروریات کا اندازہ لگانے لگا۔ جن کی تکمیل کے لئے ایک ہی وقت میں ہزار ہا روپوں کی ضرورت تھی۔ اس وقت کی رو میں ضرورت جو اس کے پیش نظر تھی۔ وہ محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی۔ میں ایک ممتاز عُہدہ حاصل کر لینے کی تھی۔ اس نے سلیم کے مُڑے تُڑے خط کی شکنیں درست کیں۔ اور اس حصّے پر پھر سے نگاہیں دَوڑائیں۔ جہاں اس نے وہ قیمتی اور مقدّس مشورہ دے کر اسے ہمیشہ کے لئے خرید لیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ اس وقت دو۔ تین آسامیاں خالی ہیں۔ اگر تم درخواست کے ساتھ ایک ہزار روپے کا بندوبست کر لو۔ تو سمجھو کامیابی یقینی ہے ٭

"ایک ہزار" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ لیکن فوری طور پر ایک ہزار کا انتظام کر لینا اس کے لئے کس قدر مشکل تھا۔ بفرض محال کسی طرح وہ اتنی رقم کہیں سے حاصل کر بھی لے۔ مگر اپنے مقصد میں پھر بھی ناکامی کا ہی مُنہ دیکھنا پڑے۔ تو

دیکھے تو ——

لیکن ایک خاصے ہوشمند جواری کی مانند اس کا یقین پختہ رہا۔ اور اس کی خواہشات کی سختی میں کسی قسم کی کمزوری پیدا نہ ہوئی —— اس وقت ہزار ہا روپے بار بار اس کے ذہن پر دل خوش کن چھناکے پیدا کرنے لگے۔ ایک ہزار —— تین ہزار —— آٹھ ہزار —— دس ہزار ——!

اس کے دادا تیس برس کی طویل ملازمت کے بعد چند دن ہوئے ریٹائر ہو کر گھر آ گئے تھے۔ ان کی تیس برس کی کاٹ اور سرکار کی جانب سے دوسری بخشیش کل ملا کر دس ہزار ہوتی تھیں۔ جن کا ذکر دادا گھر باہر بڑی دلچسپی سے کر رہے تھے —— اور جس دن وہ ہزار ہزار کے دس نوٹ سنبھالے گھر آئے تو انہوں نے دوبارہ سہ بارہ گن کر پاؤ بھر وزنی تالے میں محفوظ کر دیئے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ روپیہ فوری طور پر بنک میں رکھوا دیا جائے۔ لیکن اسی اثنا میں ان مقدمات کی تاریخیں آ پہنچیں۔ جو ان کے مزارعین نے ان پر زمین کے سلسلے میں داغ رکھی تھیں۔ دس بجے سے لے کر تین بجے تک بنک کھلتا۔ اور یہی کچہری میں پیشی کا

وقت ہوتا۔ اِس لئے روپیہ اب تک ان کے پرائیویٹ سُوٹ کیس میں بڑے اہتمام سے پڑا تھا ـــــ

سڑک کا پُرشور ماحول اب اسے ناگوار گزُر رہا تھا۔ وُہ غیر اختیاری طور پر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور کرُسی لپیٹ کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ کمرے کی چار دیواری میں ایک محدُود فضا پاکر اس کے خیالات کی منتشر اور پتلی پتلی فضا گھنی ہونے لگی اس کے سامنے والی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ جو مہینوں سے بند پڑا تھا۔ اس کے کمرے میں صرف دو ہی دروازے ایسے تھے جو اندر باہر آتے جاتے کھُلتے اور بند ہوتے۔ سامنے والی دیوار کا تیسرا دروازہ سیڑھیوں کی جانب کھُلتا تھا۔ پیچ در پیچ سیڑھیاں ایک عمودی ستون کے اِرد گرد "عشق پیچاں" کی مانند لہراتی بل کھاتی دُوسری منزل کے صحن تک چلی گئی تھیں۔ اِس صحن کے چاروں طرف چھ سات کمرے تھے۔ جن کے ایک حصّہ میں اس کے تایا اپنے بال بچّوں کے ساتھ اقامت پذیر تھے۔ اور دُوسرا حصّہ اکیلے دادا کے مصرّف میں تھا۔ اس کے تایا اور دادا دونوں ہی اس کی بیکار زندگی سے سخت تنگ آئے ہوئے

تھے۔ وہ جس وقت اسے دیکھ پاتے وہیں سے ناک بھوں چڑھا کر بیکچر پر بیکچر پلانے لگتے۔ مجید گھر بھر میں اگر کسی سے کچھ خوف محسوس کرتا۔ تو وہ یہی دونوں افراد تھے۔ ورنہ اس کے دوسرے چچا جو اس کے ساتھ نچلی منزل میں رہتے تھے۔ نہایت ہی مرنجان مرنج قسم کے شخص تھے انہوں نے آج تک دبی زبان سے بھی مجید کو بیکاری کا طعنہ نہیں دیا تھا۔ ادھر چچی تھیں۔ انہوں نے اسے اب تک حقیقی اور لاڈلے بیٹے کی طرح پالا تھا۔ مجید کو بعض اوقات خود بھی احساس ہونے لگتا۔ کہ ماں باپ کے بعد اگر اس کے سر پر ہاتھ رکھنے کو اس کے مہربان چچا بھی موجود نہ ہوتے تو اس کی زندگی کس قدر قابلِ رحم ہوتی ——!

سامنے والے دروازے کو تکتے ہوئے دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال اُچھل پڑا۔ اگر وہ اِس دروازے کو کھولے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اُوپر چلا جائے —— بائیں ہاتھ کو مُڑتے ہوئے دادا کے کمرے کی طرف بڑھے اور پھر کسی طریقہ سے اندر چلا جائے تو کمرے کے شمال مشرقی کونے میں اُوپر تلے رکھے ہوئے صندوقوں پر ایک سوٹ کیس

ہو گا.........

مجید کے حلق میں کچھ اٹکنے لگا۔ اس نے آہستگی سے کنگھارتے ہوئے سوچا کہ کھڑے رہنے کی بجائے اگر وہ پلنگ پر بیٹھ جائے تو زیادہ بہتر ہو گا اسی خیال سے وہ تکئے کا سہارا لے کر نیم دراز ہو گیا۔ اور سوچنے لگا۔ اگر وہ اس وقت کا انتظار کرے جب سُورج نصف النہار پر آ جائے۔ کرنوں کی تمازت در و دیوار کو جھلسا دے۔ اور ہر شخص اپنے اپنے کمرے میں لمبی تان سویا پڑا ہو۔ وہ اپنی چھوٹی زادبہن کے کمرہ میں داخل ہو۔ اور وہاں سے چچی کے کمرہ میں کھلنے والے دروازے کو آہستہ سے دھکیلے۔ قدموں کی چاپ پیدا کئے بغیر اسی خاموشی اور سکوت سے چچا کے کمرے میں چلا جائے۔ وہاں سے چابیوں کا گچھا تلاش کر کے.....

یکایک اس کے ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سیڑھیوں پر سے کوئی آہستہ آہستہ اُتر رہا تھا۔ پاؤں کی چاپ کے ساتھ اسے ایک بھاری بھرکم اور کونجیلی بڑبڑاہٹ بھی سُنائی دی۔ یہ دادا تھے۔ جو مقدمے کی نوعیت پر از خود تبصرہ فرماتے ہوئے کچہری

تشریف لئے جا رہے تھے۔ مجید کو یُوں محسوس ہُوا۔ جیسے کسی معمّے پر گھنٹوں مغز مارنے کے بعد اب اسے فراغت نصیب ہو رہی ہے۔ وُہ مزید آزادی کا احساس لئے پلنگ کی پُوری وُسعت میں پھیل گیا

اس نے اپنے خیالات کی کڑیوں کو پھر سے ترتیب دینا چاہا۔ مگر اب کے اسے اپنی کوشش میں ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ بلند ترین ذہنی اڑانوں میں پناہ لینے کی بجائے اس نے اپنے خیالات کو ٹھوک بجا کر دیکھنا شروع کیا۔ اسے اپنے ارادوں پر ندامت سی ہُوئی اور وُہ سوچنے لگا۔ کہ وُہ اس قِسم کے بوجھل اور کثیف خیالات کا کِس طرح متحمّل ہوتا رہا ہے۔ اس کے بعد اسے اپنے عجیب و غریب کردار پر ہنسی آنے لگی۔ اور خجالت بھری مسرّت کی ایک لہر اس کے ہونٹوں کے دونوں کونوں کے سائے تلے دیر تک پھڑکتی رہی۔

اِس کے احساس میں ابھی تک فراغت کا تاثر بدستور مَوجُود تھا۔ وُہ اُٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اور دِن کا باقی حِصّہ کِسی باغ میں آموں کے گھنیرے سایوں میں بسر کرنے کے منصوبے باندھنے لگا۔

ابھی شام مکمّل نہیں ہوئی تھی۔ کہ مجید ہرن کی کھال کی چٹائی سنبھالے اپنے کمرہ میں داخل ہُوا۔ دن بھر باغ کے گھنے سایوں میں لمبی تان سونے سے اسے خلافِ معمول کچھ عجیب سا ذہنی خلفشار محسوس ہونے لگا۔ اپنی دانست میں تو اس نے ابھی تک کوئی ایسا فعل نہیں کیا تھا جس پر اسے غیر انسانی ہونے کا احساس ہوتا۔ اس کے باوجود وُہ کچھ محسوس کر رہا تھا۔ کچھ سُن رہا تھا۔ کچھ دیکھ رہا تھا۔

مجید نے بڑی بے دلی سے چٹائی میز کے نیچے پھینکدی۔ اور تکیئے کا سہارا لے کر پلنگ پر دراز ہونے لگا۔ مگر جونہی دائیں پہلو پر ذرا بوجھ پڑا۔ تو اسے اپنے کوٹ کی جیب میں ایک کھڑکھڑاہٹ سی محسُوس ہوئی۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے ایک جست لگائی۔ اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں میں تھرتھری آ گئی۔ اور چہرہ کسی ناقابل فہم خوف کی شدّت سے پیلا پڑ گیا۔ دلی خواہش کے باوجود وُہ اپنی جیب کو ٹٹول کر نہ دیکھ سکا۔ اسے یُوں محسوس ہُوا۔ جیسے اس کی جیب میں ایک نہیں ہزار ہا بچھوؤں ڈنک تانے ایک دُوسرے سے اُلجھ اُلجھ کر گچھا بن رہے ہیں۔

اور اب وُہ نہایت اہتمام سے بائیں پہلو کے بل کرسی میں بیٹھ کر سوچنے لگا۔ کہیں اس کا دماغی توازن ہی تو جواب نہیں دے چکا۔ یا باغ میں سوئے سوئے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ مگر ایک خواب کا یہ تاثر؟ ——— اس کے ساتھ ہی مجید کی جیب میں ایک بار پھر چرچراہٹ ہوئی اور اس کے جسم کی کانپتی ہوئی جلد ایکبارگی زور سے پھڑک اُٹھی +

پھر اسے یُوں محسوس ہُوا۔ کہ اس نے واقعی کسی بہت بڑے جُرم کا ارتکاب کیا ہے +

ایک لمحہ کے لئے اسے اپنے کوٹ کی داہنی جیب سے خوف محسوس ہُوا اس نے چاہا کہ کوٹ اُتار کر آگ کے شعلوں کی نذر کر دے مگر خیالات کے مُہلک ترین شعلوں میں جہاں اس کا دماغ جل رہا تھا۔ سر سے لے کر پاؤں تک ایک ایک مسام تڑاخ تڑاخ پھٹ رہا تھا۔ وہاں یہ کوٹ جل کیوں نہیں جاتا +

اچانک اسے مکان سے غصّے اور حیرت میں ڈوبا ہُوا ایک ملا جلا سا شور سُنائی دینے لگا۔ وُہ حیرانی کے عالم میں

دروازے سے کان لگا کر اس شور سا تجزیہ کرنے لگا مگر آوازیں آپس میں اس قدر اُلجھ رہی تھیں۔ کہ وُہ تنگ آ کر دروازے سے ہٹ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اسے اپنے سینے میں دل کی خوفزدہ دھڑکن محسوس ہوئی۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا

اس کے چچا چیخ اُٹھے "مجید۔ مجید۔ آج صبح سے کہاں غائب ہو۔ تمہیں معلوم ہے۔ تمہارے دادا کی چوری ہو گئی۔ "دس ہزار کی چوری"۔

مجید کے پُرسکون چہرے پر یکلخت کھلبلی مچ گئی۔ وہ گھبرا اُٹھا۔ دل بیٹھنے لگا۔ جیسے کوئی اس کی اپنی عمر بھر کی کمائی لُوٹ کر لے گیا تھا۔ دادا پریشانی کے عالم میں اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر آ جا رہے تھے۔ گھر بھر میں تعجب اور حیرانی کی ایک لہر دوڑ چکی تھی۔ ڈاکہ۔ دن دہاڑے ڈاکہ۔ ایک بھرے گھر میں ڈاکہ ——

آج کا دن مجید کے تایا اور اُن کے بیوی بچوں نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کے ہاں کاٹا تھا۔ دادا چار پانچ بجے تک کچہری میں دَوڑ بھاگ کرتے رہے گھر میں اگر کوئی

موجود تھا۔ تو مجید کے وہ شریف النفس چچا جن کی وہ سچے دل سے عزت نہیں پرستش کرتا تھا۔ پولیس میں رپورٹ دی جا چکی تھی۔ اور کوئی دم بھر میں پولیس تفتیش کے لئے موقعۂ واردات پر پہنچ جانا چاہتی تھی ؎

مجید پولیس کے خیال ہی سے کانپ اٹھا۔ وہ سوچنے لگا کہ واقعات کی ترتیب سے حقیقی مجرم کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے مزید کارروائی تو بعد میں ہو گی۔ لیکن سب سے پہلے چچا کے بوڑھے ہاتھ —— جنہوں نے آج تک کسی ذی روح کو تکلیف نہیں دی تھی۔ ہتھکڑی کی آہنی گرفت میں جکڑ دیئے جائیں گے ؎

اسے یقین تھا۔ کہ پولیس جو اعلانیہ مجرم کو یہ بتا کر آتی ہے۔ کہ ہم تمہارے جرم کا کھوج لگانے آئے ہیں۔ اصلی مجرم کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لیکن مجرم کی رگوں میں اچھلنے والے خون سے بھی قریب رہنے والا خفیہ پولیس کا وہ وجود ضرور کامیاب ہو سکتا ہے جس نے مجرم کے ساتھ لگ کر اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش کا مطالعہ کیا ہو ؎

مجید کچھ سوچ کر اُٹھا۔ صحن میں چاروں طرف اوپر نیچے تنقید بھری نگاہ دَوڑائی اور پھر اپنے مظلوم چچا کے قریب جاکر رُک گیا۔ اس کے تایا واقعے کی نوعیت کو ازسرِنو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دادا ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا سہارا لئے اپنے منتشر خیالات کا بار بار اعادہ کر رہے تھے۔ اور اس کے چچا سر جھکائے آنے والے واقعات کے اندر اپنے آپ کو تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ یکایک اس نے ایک پُر اسرار مگر یقین بھرے لہجے میں ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"میرے خیال میں چور سب سے پہلے میرے کمرے میں تھا"۔

اِن کی بوکھلائی ہوئی نگاہیں یک دم اس کے سنجیدہ چہرے سے ٹکرائیں۔ دادا کے ہونٹ کپکپا اُٹھے:

"کون کہتا ہے"۔

"میں" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"یعنی تم جانتے ہو۔ چور کون ہے۔؟"

وہ ایک بار چونک اُٹھا۔ ایک لمبا سانس پھیپھڑوں میں بھر کر بولا ــــ "ہاں"

"کون ہے۔ بتاؤ بیٹا۔ کون ہے؟"

"میں اسے جانتا ہوں"۔

"کون ہے۔ کون ہے وہ بدمعاش؟" اب کے دادا غصّے کی افراط سے گرج اٹھے۔ مجید نے اسی سکون سے جواب دیا — "کیا آپ لوگ میرے ہمراہ آئیں گے"۔

مجید اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی ریکارڈ کی طرح بجنے لگا۔ "چور سب سے پہلے اس کمرے میں تھا۔ یہاں کچھ دیر توقف کر کے اس نے بہت کچھ سوچا — بہت سی تجویزیں کیں۔ اس کا خیال تھا۔ کہ سورج کی تیز اور بپھری ہوئی کرنیں در و دیوار پر غالب آ جائیں۔ اور گھر کے سب افراد اپنے اپنے کمروں میں لمبی تان سو جائیں۔ تو وہ خاموشی سے پہلے صحن میں داخل ہو —" مجید آہستہ آہستہ سرکتا ہوا صحن میں آ گیا۔ صحن میں آ کر وہ بانو کے کمرہ میں داخل ہوا۔

مجید اس کی ہر حرکت کا تفصیل سے ذکر کرتا ہوا۔ انہیں اپنی چھوٹی چچازاد بہن کے کمرے سے لیتا ہوا۔ چچا کے کمرے تک چلا گیا۔

"یہاں آ کر اسے چچا کی چابیوں کا گچھا سنبھالا۔ اس کے چچا۔

تایا۔ دادا۔ حیرت اور تعجب کے مارے گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ مجید کے انداز میں ایک عجیب آفاقی جھلک تھی۔ جادو کی ایک رو تھی۔۔ جو اس کی سنجیدگی سے اُبھر اُبھر کر سب کو اس کا ہر حکم ماننے پر مجبور کر رہی تھی۔ مجید یہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہُوا۔ سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ سیڑھیوں کو دیوانوں کی مانند طے کرتا ہُوا۔ دادا کے کمرے میں داخل ہوا تھوڑی دیر میں اس کے تینوں بزرگ ——— ہانپتے کانپتے اندر آئے +

دادا نے اپنا پرائیویٹ سُوٹ کیس جس حالت میں کھُلا دیکھا تھا پولیس کی تحقیقات کے لئے اسے ویسا ہی چھوڑ دیا تھا۔ قریب ہی لوہے کی موٹی وزنی چادر کے سیاہ ٹرنک پر کھُلا ہُوا تالا زبانِ حال سے گزُرے ہوئے واقعات کو دہرانے میں مشغول تھا۔ مجید نے گچھے میں سے ایک بڑے سایز کی چابی انتخاب کی۔ اور اسے تالے میں گھُما گھُما کر ٹسٹ کرنے لگا۔ پھر یکایک اس کے چہرے پر رنگ آ گیا۔ اس نے تالا ان کے سامنے بند کرتے ہُوئے چابی اُلٹی گھما دی۔ تالا کھٹاک سے کھُل۔ اور مجید کامیابی کے پُرزور احساس سے چیخ اُٹھا

——یہی تھی —— بالکل یہی —— اِس بدمعاش نے اسی چابی کی مدد سے آپ کا دس ہزار روپیہ اُڑایا ہے۔"

مجید کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے چابی اس انداز سے اُنگلیوں کی گرفت میں لے رکھی تھی۔ گویا صدہا سال کی کوشش کے بعد وہ اس محیّر العقل ایجاد کی دریافت میں کامیاب ہُوا تھا۔ یکایک دادا نے امید و بیم سے کانپتی ہوئی آواز میں پُوچھا:

"مگر روپیہ؟"

"روپیہ؟"

مجید کے بشاش چہرے پر سنجیدگی آ گئی۔ اس نے جلدی سے کوٹ کی بیرونی جیب میں ہاتھ ڈالا —— جیب میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ مجید کا دل پہلو میں ایک بار زور سے اُچھل پڑا۔ اس نے ہاتھ بڑی آہستگی سے باہر کھینچا —— تایا لپکے —— اس کے ہاتھ پر تقریباً جھپٹ پڑے۔

مگر —— مگر —— یہ تو محکمہ سی آئی ڈی کے لئے

ایک درخواست ہے ۔

وُہ مجید کے ہاتھ درخواست چھینتے ہُوئے چلاّئے۔ اور دادا کی بجھتی ہوئی نگاہیں پکاریں ۔

"مگر روپیہ؟"

مجید کی نگاہیں درخواست سے ٹکرا کر بوکھلا اُٹھیں۔ اس نے کاغذ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہُوئے دوبارہ اپنی جیب کا جایزہ لیا۔ پھر اپنے کوٹ اور قمیص کی تمام جیبوں کی تلاشی لی مگر........!

کافی

دو چار گھونٹ حلق سے اُترتے ہی اس کی تھکی ہوئی سوچ پھڑ پھڑاتی۔ پر تولتی اور اس کے خیالات ایک ہی زقند میں آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں تیرنے لگتے کافی کے خمار کا تاثر! اور ایک مسرّت اس کے چہرے پر تازگی بن کر جھلکنے لگتی۔ گالوں پر چکناہٹ اور باتوں میں شگفتگی بن کر عَود کر آتی۔ اس وقت وُہ اپنی زندگی کے تلخ حقائق کو بھی مزے لے لے کر بیان کرتا۔ ایک بے نام سی غم انگیز دل افروز سُرور اور خُون کی مانند سرکتی ہوئی مٹھاس۔ ——— غرضیکہ کافی پی کر اس کی باتوں میں زندگی کا ہر پہلو اجاگر ہو جاتا؛

سائے ڈھل جاتے۔ تو شام کی چہل پہل کے ساتھ اس کے جسم میں بھی حرکت ہوتی اور وُہ مجھے ساتھ لئے

قریب کے کیفے میں داخل ہوتا۔ فضا میں رمی ہوئی کافی اس کے دماغ میں پہنچ کر عضو عضو کو پھیلنے پر مجبور کر دیتی۔ کچھ دیر کے لئے اس کی حالت تساہل پسند بھینسے کی سی ہو جاتی اور پھر کافی کا دور چلتا۔ مجھے کافی زیادہ پسند نہ تھی۔ وُہ اصرار کرتا تو کبھی کبھار پی لیتا۔ ورنہ خاموشی سے آئس کریم کھاتا یا پھر لیمونیڈ کی ایک آدھ بوتل پر اکتفا کرتا اور وُہ ...... بل دیکھ کر اُلٹا سیدھا ہونے لگتا۔ اِس بلانوشی کی شدّت کو کم کر دینے کے منصوبے باندھنے لگتا۔ لیکن جونہی کافی کا ہلکا ہلکا خمار ذہن میں حل ہو کر رہ جاتا۔ اسکی دنیا کے گرد پھر وہی بیرے منڈلانے لگتے۔ برف میں لگی ہوئی کافی اس کے ترسے ہوئے حلق سے کھیلنے لگتی۔ لیکن بل دیکھ کر وہ کچھ چونک سا جاتا۔ اور وُہ باتوں ہی باتوں میں مجھ سے دستگیری کا طالب ہوتا اور کافی سے بیگانگی سی محسوس کرتے ہوئے بھی مجھے اس کی خاطر وُہ موٹا تازہ بل ادا کرنا ہی پڑتا اور وہ میرے ایثار کو تشکّر بھری نظروں سے دیکھنے کی بجائے۔ بل ادا کرنے کے فائدے سمجھانے لگتا...... اور ساتھ ہی کافی کی شان میں ایک لمبی چوڑی

ہجو بھی شامل کر دیتا اور یہ حرکت وہ دیدہ دانستہ کرتا۔ تاکہ مَیں چڑوں اور اس کی ستم ظریفی سے بوکھلا کر گالیاں دینے پر اُتر آتا وہاں ایسی تہذیب سے دُور حرکتوں پر تو میں بہت دفعہ اترا پر اس کا بدلہ ادا نہ کرنے کی ہمّت مجھ میں پیدا نہ ہوں گی۔

وُہ بہت کچھ کہتا اور مَیں تعجّب، حیرت سے سب کچھ سُنتا اور دیر تک سوچتا رہتا۔ کیا وہ شخص ہنس سکتا ہے۔ مُسکرا سکتا ہے۔ جس کی رُوح کا اطمینان اتنی بے دردی سے مجروح کر دیا گیا ہو۔ لیکن وہ قہقہے لگاتا۔ مُسکراہٹوں میں نہاتا اور اپنے ماضی کو ٹٹول ٹٹول کر مسلسل چیخے جاتا۔ زندگی کی تلخ کامیوں پر اتنے کامیاب اور طنز بھرے قہقہے! مجھے اس کی جُرأت پر رشک آنے لگتا۔

اس کی باتوں کا موضوع اس کی خوبصورت اور نوجوان بیوی تھی۔ جانے کیا بات تھی۔ کہ مَیں جواد کی باتیں سُن سُن کر آنکھوں ہی آنکھوں میں نجمہ کی تصویر بنا لیتا۔ اور ساری ساری رات اسی تخیلی عورت سے باتیں کرنے میں کاٹ دیتا۔ جاگتے ہوئے شعوری طور پر اور سوتے میں وُہ خواب بن کر

میرے بہت قریب چلی آئی +

جوآد کی شادی کے ابتدائی مہینے بڑھتے ہوئے چاند کی مانند روز بروز دلکش ہوتے گئے۔ لیکن جُوں جوں وقت گزرتا گیا۔ جوآد اور نجمہ کے تعلّقات میں عجیب نا قابل جنم موڑ گیا۔ پہلے تو اس کی تعریفیں کرتا تھکتا نہیں تھا۔ مگر اب اس کی بالکل تازہ رائے نجمہؔ کے متعلق یہ تھی۔ کہ وُہ اس کافی، جو سامنے رکھی ہے، اس سے کسی حال میں بھی مختلف نہیں۔ ان دونوں میں ایک سی غم انگیزی تھی۔ وہی دل افروز سرور۔ اور خُون کی مانند رواں دواں ایک مٹھاس بھی ہے۔ اور دونوں کا نقش میری زندگی میں اِس طرح گہرا ہے۔ کہ شاید وقت کی تیز بوچھاڑیں اسے مدھم کر سکیں +

جوآد نجمہ کے خدوخال۔ افعال و کردار پر کھُلم کھُلا حاشیہ آرائی کرتا ــــــ وہ جذبات کے ہاتھوں کھلونا بننے والی عورت۔ جب احساسات کی لہروں پہ ناچ ناچ کر تھک جاتی۔ محبّت بھرے گیت گا گا کر بے بس ہو جاتی ہے۔ تو پھر اسے اپنی گذشتہ حرکتیں اچھّی نہیں لگتیں اور وُہ ان پر اظہار افسوس کرنے کی بجائے ہر بھُول کے لئے مجھے موردِ الزام

قرار دیتی ہے۔ بدمزاجی اس پر غلبہ پا لیتی ہے۔ ایسے میں....
وہ جھنجھلاتی۔ سٹپٹاتی اور چیختی ہوئی مجھ پر برستی ہے۔ مگر
جب وہ اپنے اس طرزِ عمل سے بھی اُکتا جاتی ہے۔ تو پھر میں
کسی قسم کی آمادگی کا جذبہ نہ پاتے ہوئے مجھے چھیڑتی ہے۔
پیار بھرے گیت گاتی ہوئی گردن میں باہیں ڈال دیتی ہے
میں بے شمار کشمکشوں اور اُلجھنوں میں سر دیئے اس کی جانب
استفہامیہ نگاہوں سے تکا کرتا ہوں ــــــ اس وقت نجمہ
کی بے چارگی اور بے بسی بھی نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔
اسے اپنے کئے پر ندامت ہونے لگتی ہے۔ تو وہ میرے گھٹنوں
پر سر رکھ کر رونی صورت بنا لیتی ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں
میں کہتی ہوئی معلوم ہوتی ہے آج تم بہت ناراض ہو۔ تمہارے
قہقہے کیا ہوئے۔ تم ہنستے کیوں نہیں۔ تم ہم سے بولتے کیوں
نہیں ــــــ میں اپنی اُلجھنوں کو بھول کر نجمہ کی کس مپرسی
پر متاسف ہونے لگتا ہوں ــــــ نجمہ کے ساتھ زندگی بسر
کرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا کافی کے تالاب
میں ڈبکیاں لگا رہا ہوں۔ مٹھاس ــــــ تلخی ــــــ
سرور اور مٹھاس کا یہ مخلوط احساس اس کی میری دنیا پر

گُرزے کی طرح محیط ہے۔

اپنی اور جوآد کی راتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مَیں کہتا۔ "رات کمبخت گزُرنے میں نہیں آتی ——" وہ تاسف اور شرارت بھرے لہجے میں کہتا "یہاں تو یہ محسوس ہوتا ہے۔ دو اڑھائی گھنٹے سے کچھ ہی اُوپر ہوتی ہو گی" اور مَیں کھوئے کھوئے انداز میں کہتا۔ "بھئی! تمہاری بات الگ ہے ——" اس وقت میرے دل میں نہ جانے کیسے ان بوجھے اور معصوم جذبات جھرجھری لے کر وہ جاتے اور مَیں چاہتا کہ جوآد اپنی نجمہ کے متعلّق کچھ کہے۔ اپنی پُرکیف راتوں کی لفظی تصویر کھینچے۔ مَیں نہیں جانتا۔ وہ میری اس خواہش کو بھانپ لیتا۔ وُہ آپ سے آپ نجمہ اور اس کے حُسن پر ایک دلکش سی تقریر میرے پیاسے کانوں میں ٹھونس دیتا مَیں چاہتا اس کی باتیں کبھی ختم نہ ہوں وُہ ہمیشہ ایسے ہی۔ اسی طرح۔ اپنی تلخ و شیریں محبّت کا راگ الاپتا رہے —— اور مَیں کان دھرے خُوب غور سے اس کی دلچسپ باتوں سے اپنے آپ کو بہلاتا رہوں۔

کبھی تو مَیں سوچتا آخر اس بلانوش کے بل میں کیوں ادا کرتا ہوں۔ کیا وُہ میرا ایسا ہی جگری دوست ہے کہ

مجھے اس کی خاطر، ہمّت سے بڑھ کر فیاضی دکھانے کی ضرورت ہے۔ یقیناً نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ——— اس کے بعد میرا ذہن ہمیشہ مجھے اپنی ویران زندگی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتا۔ جہاں کی تاریکیوں کا سینہ شق کرنے کے لئے کسی کی برق پاش مُسکراہٹوں کی ضرورت تھی اور وُہ مُسکراہٹیں ——— جوّاد کہا کرتا۔ نجمہ مُسکراتی ہے۔ تو کائنات رقص کرتی ہوئی معلوم دیتی ہے۔ وُہ بات کرتی ہے تو کانوں میں امرت گھول دیتی ہے۔ اور ایسے لمحے مجھُ پر بڑی آفت ڈھاتے ——— یہ ایک انوکھی سی بات تھی کہ جوّاد نجمہ کا سراپا بیان کرتے ہوئے سرور کے مارے جھُوما کرتا۔ لیکن اس کی عادات کا خاکہ اُڑاتے ہوئے عجیب عجیب مُنہ بناتا۔ جیسے زبان کی ملائم سطح پر نرستی چُبھ رہی ہو۔ وُہ ہر روز ایک نئے زاویے سے میرا نجمہ سے تعارف کراتا اور مَیں کسی قسم کی بدمزگی محسوس کئے بغیر اس کا بل ادا کر دیتا۔

ایک دن اس کی باتوں میں تلخی بڑھ گئی۔ بڑے پُرزور الفاظ میں کافی کی تضحیک کرنے لگا۔ میری طبیعت میں ایک شورش سی لہر انگڑائی لے کر بیدار ہوئی۔ مَیں نے پوُچھا۔ تمُہیں کافی سے نفرت ہے؟" اس نے اپنی خواب ناک آنکھوں سے

مجھے گھورا "کافی؟ - کونسی کافی ——— ؟ اس نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "وہ بھی تو کچھ دو نہیں" میں نے پیشینگوئی کرتے ہوئے کہا "تو تمہیں نفرت ہے کافی سے" وہ جلدی سے کہہ اُٹھا "میں نے کب کہا" "تو محبت ہے" اب کہ وہ بھر تڑاق سے بولا "نہیں تو - میں نے یہ بھی نہیں کہا" مجھے محسوس ہُوا اس کے چہرے پر سے مایوسی کی لکیریں آہستہ آہستہ مدھم ہوئی جا رہی ہیں - میں نے بھی جواباً کہا "نہ یہ نہ وہ ——— تو آخر کیا - اس نے میری بدحواسی پر ایک نقد بہ نقد قہقہہ رسید کیا اور کافی کا آخری گھونٹ حلق سے اُتار کر کہنے لگا "دراصل ہوتا بھی کچھ یونہی ہے - ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کہنے اور نہ کہنے کے درمیان عدم اور وجود کے درمیان - جنّت اور جہنّم کے درمیان وہ سر سے لے کر پیر تک کافی سے تخلیق ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ اسے دیکھ کر شعر سوجھتے ہیں اور اسے دیکھ کر عظیم المرتبت نثریں ——— تم اپنی کہو - تلخی سرور اور مٹھاس اگر تینوں چیزیں تمہیں ایک ساتھ میسّر آ سکیں - تو تم ان سے محبت کرو گے - یا نفرت؟"

"میں ان کے صرف بل ادا کروں گا"

اس نے اپنی خفت کو مٹانے کے لئے پُر زور قہقہہ لگایا۔ "صرف بل ادا کرو گے۔ کبھی پیو گے کچھ نہیں۔" اس وقت مجھے معاً نجمہ کا خیال آ گیا۔

"کافی!" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا اور ایسے انداز میں کہ اس کا ذہن فوراً نجمہ کی طرف منعطف ہو جائے۔ "تم کافی مجھے پلاؤ گے۔ عجیب بیوقوف آدمی ہو۔" جواد کے چہرے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے چمکنے لگے۔ "تمہیں غلطی ہوئی۔ کافی سے میرا مطلب ......" اور میں نے اسے مزید چڑاتے ہوئے کہہ دیا۔ "لیکن یہ اور وُہ دو نہیں۔ ایک ہیں ——— صرف ایک ——— ایک سمجھتے ہو نا یعنی ......"

جواد کا چہرہ سلوٹوں کے سیلاب سے بھیانک ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ گرم اور تُند کافی اس کے احساس میں حل ہو کر طوفان لا رہی ہے۔ "مجھے ایسا مذاق قطعاً پسند نہیں۔" اس نے بیقراری سے کہا۔ اور جواباً میں نے خاموشی کا اظہار کیا۔

جواد سے رخصت ہو کر بازار میں سے گزر رہا تھا تو زیورات کی ایک دُکان کے قریب پہنچ کر میرے پاؤں از خود

رُک گئے۔ مَیں اس دُکان پر تضیع اوقات کے لئے اکثر دن دن بھر بیٹھا رہتا۔ دُکاندار سے گپیں لڑاتا اور آنے جانے والوں پر فقرے چست کرتا۔ اس وقت دُکاندار ایک ایک بُرقعہ پوش خاتون سے جھگڑ رہا تھا۔ موضوعِ سُخن کوئی بقایا رقم تھی۔ خاتون نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تو جیسے چونک سی گئی "اوہ آپ!" اور میں چکرانے لگا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے میرے قریب آئی اور نقاب اُلٹ دیا۔ سیاہ برقعے میں اس کا سفید اور گلابی چہرہ یقیناً کسی نظم ہی کا موضوع ہو سکتا تھا۔ مَیں نے قدرے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "شاید آپ کو غلطی لگ رہی ہے۔ مطلب یہ کہ دھوکا ہُوا آپ کو مجھے پہچاننے میں غلطی کی ہے آپ نے"۔

"غلطی۔ کیسی غلطی؟ آپ مسٹر جواد کو نہیں جانتے" "مسٹر جواد! آپ کا مطلب ہے میرے دوست" اس وقت تک میں نے اپنے کو سنبھال لیا تھا۔

"تو آپ اس وقت مسز جواد سے مل رہے ہیں" میری آنکھیں ایک جھٹکے کے ساتھ پھیلیں اور میں بڑی مشکل سے کہہ سکا "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر"۔

آئیے ذرا میرے ساتھ! مجھے کچھ دیر شاپنگ کرنی ہے۔ کیا میں آپ کو تکلیف تو نہیں دے رہی،" کمال کرتی ہیں۔ مسز جواد آپ بھی۔ تکلیف کیسی؟ مگر یہ تو بتائیے۔ آخر آپ نے یہ کیسے جان لیا۔ کہ جواد صاحب اور میرے درمیان ...... وہ بات کاٹ کر بولی یہ چھوڑیئے اِس بات کو۔ شاید اِس بات کو بھول رہے ہیں آپ کہ ہمارے ہاں آنے کا آپ کو بہت دفعہ اتفاق ہُوا ہے، خیر اب آئیے مجھے بہت جلدی ہے۔ اور اس دن اس لڑکی نے جتنی چیزیں بھی خریدیں اُن سب کے بِل میری جیب سے نکلے ٭

اِس واقعے کے بعد وُہ مجھ سے کئی بار ملی۔ اس نے ہر بار مجھ سے کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کی۔ مگر اس طریق سے کہ مَیں اس کی فرمائش پُوری کرتے ہوئے بھی مسرّت محسوس کرتا۔ اس کے بعد میری طبیعت میں خود بخود ایک لہر اُٹھی اور میرا رواں رواں اِس لہر کے تموّج پہ تھرک اُٹھا ـــ مجھے تحفے خریدنے کا جنوں سا ہو گیا۔ کچھ کہہ نہیں سکتا جوّاد کو یہ سب کچھ کیسے معلوم ہو گیا۔ ہماری بڑھتی ہوئی مُلاقاتوں کی بھنک اس کے کانوں میں پڑی اور وُہ

غصّے کے مارے بل کھا اُٹھا۔

شام کا وقت تھا۔ آسمان پہ بادل گھر آئے تھے۔ میں کرسی صحن میں پھیلائے بادلوں کی دوڑ بھاگ کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یکایک دروازے کے پٹ دندنا اُٹھے اور جواد ہوا کے تیز جھونکے کی مانند اندر آیا۔ میں گھبراہٹ کے مارے تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا ہوا۔ کیا ہوا جواد" میں نے دیکھا۔ اُف۔ اس کے ہونٹ غصّے کے مارے بُری طرح پھڑک رہے تھے۔ شاید وُہ بہت کچھ کہہ دینا چاہتا تھا۔ لیکن بہت سی باتیں ایک ساتھ نہیں کہی جا سکتیں ـــــــ "یہ بات کیا تھی جواد۔ تمہاری آنکھیں انگاروں کی مانند دُھک رہی تھیں۔ ابھی ابھی۔ کدھر سے آئے ہو۔ چہرے مہرے سے جواد اس وقت سخت سُست سُنا دینے پر تُلا ہُوا تھا۔ لیکن اس کے ذہن کا توازن اس کے اپنے بس کی بات نہ تھی۔ مُشکل سے صرف یہی کہہ سکا۔ کافی ہاؤس تک میرا ساتھ نہیں دو گے تم۔!"

حالانکہ اس وقت میں دیکھ رہا تھا۔ کہ کافی ہاؤس جانے

مَیں ایک مُبہم سے خوف سے مرعوب ہو کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ ابھی تک اس کی حالت اس مُردہ آتش فشاں پہاڑ ایسی تھی۔ جو عنقریب اپنے سینے کا تمام تر لاوا اُگل دینے کو تیار رہو۔ اس کی زہر میں بُجھی ہوئی خاموشی سے میرے دل میں کھد بدی ہونے لگی۔ تاہم کسی نہ کِسی طرح اس کے عقب میں گھسٹتا ہُوا مَیں مقابل کی کرُسی میں بیٹھ گیا۔ گرم کافی کا آرڈر دے کر وہ میری طرف متوجّہ ہُوا۔ اس وقت کافی ہاؤس میں آنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ مَیں نہیں جانتا۔ جو بات میں تم کہنی چاہتا تھا۔ وُہ ابھی تک میرے دل میں زہر بن کر کیوں اُبل رہی ہے۔ کیوں اُچھل کر۔ باہر نہیں آپڑتی"؟

مَیں کچھ دیر خاموشی سے اپنے برابر والی سیٹ میں ایک جوڑے کو ہنسی خوشی باتیں کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اور پھر جوآد کی طرف متوجّہ ہوتے ہوئے مجھے خیال آیا۔ آخر جوا دوہ بات تو مجھُ سے پُوچھ ہی لیگا۔ اسے پتہ چل چُکا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا۔ کہ اس گے کچھ کہنے سے پیشتر مَیں اپنی صفائی میں وُہ سب باتیں کہہ دُوں۔ جو کافی ہاؤس تک آنے میں میرے شعور نے اپنی صفائی کے لئے کھوج لی ہیں۔

"کیا مَیں پُوچھ سکتا ہُوں۔ تُم.....؟"

"دوست ہو۔ کہ....." میرا یہی خیال تھا۔ کہ وہ دوستی میں کے تقدس کو مقابل میں لا کر مجھے شرمندہ اور ذلیل کرے گا۔ مگر وہ خاموش رہا۔ اور گھونٹ گھونٹ کافی پینے میں مصروف رہا۔ بہت دیر تک اس کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ تو مجھے۔ یُوں معلوم ہُوا۔ کہ تھوڑی دیر اور یہی فضا قائم رہی۔ تو وُہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگے گا۔ بولا:

تم نے آج تک میرے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ مجھے اکثر، وقت پڑنے پر کسی سخت ضرورت کا سامنا ہُوا۔ تو تم آڑے آئے۔ مجھے یاد نہیں کتنی مرتبہ تم نے میرے، ہوٹل اور کافی کے بل ادا کئے ہیں۔ اور ان سب کی رقم کیا بنتی ہے۔ لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں۔ کہ یہ سب تمہاری ہی ہمّت تھی۔ جو ایک دوست کی خاطر تم نے پیشانی پر ایک سلوٹ تک نہیں آنے دی۔ یہ، اور دُوسری بہت سی باتیں۔ جو اس وقت میرے ذہن سے باہر ہیں، ان سب کے لئے مَیں تمہارا بیحد شُکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی تم سے میری ایک التجا ہے۔ کہ ساری رقم جو تم نے آج تک

میری ذات پر صرف کی ہے۔ تم اس کا اندازہ مجھے بتا دو۔ تاکہ جتنی جلدی ہو سکے۔ میں تمہارا قرض اُتارنے قابل ہو سکوں! میں نہیں چاہتا.... میں کچھ نہیں چاہتا..... آئندہ تم میری خاطر ایک پائی مت صرف کرو۔!....“

وُہ باتیں کرتا رہا۔ کافی کے پیالے چڑھاتا۔ اور میں کان لپیٹے۔ اس کی روئی آواز اور گفتگو کے طنزیہ انداز میں ڈوب کر اپنے آپ کو ملامت کرتا رہا۔ میرا ضمیر اس وقت پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔ اور میرے ذہن وقوے کی سب طاقتیں ماؤف ہو چکی تھیں ؛

میرا بل سامنے رکھ گیا تھا ؛

میں نے سوچا۔ جو آد کی باتوں کا جواب دینے کی بجائے مناسب یہی ہے۔ کہ چُپکے سے اُٹھ کر گھر چلا جاؤں اور پھر کبھی اپنی صُورت نہ دکھاؤں۔ میں اُٹھ کر جانے لگا۔ اس نے تڑپ کر غیر ارادی طور پر اپنی جیب تھپتھپائی ؛

”ارے تم کہاں جاتے ہو بھئی؟ ابھی آ کے بیٹھے تو کچھ زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا۔ اور پھر میں تمہیں آج ایک بڑی عجیب خبر سنانا چاہتا تھا۔ اسی نجمہ کے متعلق ہیں تو۔ بھلا ایسی

دلچسپ باتیں اور کس کے متعلق ہو سکتی ہیں۔ یار عجیب طرح کی شریر اور ناچنت لڑکی ہے۔ کہنے لگی ......

بیرا سر پر کھڑا تھا۔ اور مجھے سخت اُلجھن ہو رہی تھی۔ ایک بار تو جی میں آیا۔ کہ اُٹھ کر فوراً ہی چل دوں۔ بھلا کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے دُوسرے لوگ کیا خیال کرتے ہوں گے۔ کب سے بیرا سر پر کھڑا ہے۔ اور اسے نجمہ کی باتیں کرنے ہی سے فرصت نہیں *

مَیں نے پیسے نکال کے بل ادا کر دیا۔ اور اپنی سیٹ میں اور بھی آرام سے دھنس کر جواد کی باتیں سُننے لگا*

چیت

داروغے کے کبھی نہ ختم ہونے والے ذاتی کام کرنے کو تو وُہ روز ہی جیل سے باہر نکلتا تھا۔ لیکن اس دن جب اسے ایک برس کی بامشقّت خدمات کے بعد رہا کیا گیا۔ تو اسے یُوں محسُوس ہُوا کہ وُہ ایک قید سے نکل کر دوسرے بہت بڑے زندان میں داخل ہو رہا ہے۔ اِس جگہ سے تو وہ دس بارہ مہینے کے بعد رہا ہونے کا تصوّر کر سکتا تھا۔ مگر وُہ قید۔! وُہ حبس! وُہ زندان —— ! جہاں ایک نیا داروغہ اس کے انتظار میں کھڑا ہے۔ ایک نئی زنجیر اس کے پاؤں میں بج اُٹھنے کو تیّار پڑی ہے۔ وُہ زنداں، داروغے کی جیل کی دہلیز سے شروع ہو کر اسے افق کی حدّوں کو چھُوتا ہُوا دکھائی دینے لگا۔ اور وُہ گھبرا کر شہر کو جانے والی سیاہ اور کُشادہ سڑک پر تیز تیز بھاگنے لگا۔

اس کے قدم پھر سُست پڑ گئے۔ اور وہ اپنی ایک سال قید بامشقت کے ایک ایک دن اور ان کے واقعات کی تفصیل کو دوبارہ دل و دماغ پر چھایا ہُوا محسوس کرنے لگا۔ اِس عرصے میں کِتنی مرتبہ اسے سزا ملی۔ کِتنی بار وُہ داروغے کے سامنے اکڑ بیٹھا۔ اسے جھاڑیں بتائیں اور کِتنی مرتبہ اس بدزبان انسان سے لچھے دار اور واہیات گالیاں بھی سُننی پڑیں..... سڑک کے دونوں طرف ہرے بھرے باغات کے بے شمار جُھنڈ کھڑے تھے۔ لوہے کی کانٹے دار باڑ کے جنگلے کی سبز اور گھنی باڑ۔ کھٹّے مٹھّے۔ سنگترے۔ بلند و بالا یوکلپٹس اور ان کے درمیان گھری ہوئی خوبصورت کوٹھیاں۔ اس کے بدن میں جھر جھری سی دوڑی اور وُہ سر جھکا کر دوبارہ اپنی سوچ میں ڈُوب گیا.....

سزا کے آخری دنوں میں اسے جیل سے باہر نکل کر کام کاج کرنے کی اجازت تھی۔ تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں رہا تو چکّی پیسی۔ باہر نکلا تو جیلر کے نجی کام انجام دینے دوبھر ہو گئے۔ دن میں بیسیوں بار جیل سے شہر اور شہر سے جیل بھاگم بھاگ آنے جانے کے باوجود، داروغہ کا مضبوط

ڈنڈا اور سینے میں چھید کر دینے والی واہیات گالیاں۔۔۔۔ وُہ چلتے چلتے پیٹھ کھجلانے لگا۔

یکایک اس کے احساس میں ایک عجیب سی حرکت ہوئی اس کی نس نس نے انگڑائی لی۔ آس پاس کی ہریالی سے ایک دلفریب کیفیّت جھلکی۔ اسے تعجّب ہُوا کہ اب وُہ نہایت آسانی سے سارے شہر کا چکّر لگا سکتا ہے۔ اور جتنی راتیں چاہے آرام سے گھر بھر بسر کر سکتا ہے۔

سڑک تیزی سے قدموں کے نیچے سے سرک رہی تھی۔ ایک جھٹکا لگتا اور سڑک تین چار فٹ پیچھے پھسل جاتی۔ جیسے دمہ کا مریض ایک ایک سانس کا محاسبہ کر رہا ہو۔ زندگی مختلف جھٹکوں کا نظر فریب اجتماع ہی تو ہے۔ وُہ سوچنے لگا۔ ایک جھٹکا ہی تو تھا۔ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ جیل ہو گئی۔ یعنی دو سال لمبی خواہ مخواہ کی قید! پھر ایک اور جھٹکا آیا۔ وُہ آزاد ہو گیا —— لیکن آزادی کے خیال کی مسرّت سے اسے دو سال کی جیل کا زیادہ غم تھا ——

حالانکہ بات صرف اتنی ہوئی وہ بھُوک بہلانے نکلا تھا۔ بھُوک! جو برسوں سے اس کے مقصوم پر مر تھی۔ جس کا

احساس اس رات یکایک اس کے دِل میں بڑھ گیا۔ آخر کتنے کتنے دِن ایک ساتھ ان کے ہاں چولھا نہیں جلتا۔ لباس و آرائش کی ضروریات رہیں ایک طرف انہیں کھانے کو پیٹ بھر کر اناج میسّر نہیں آتا۔ کیوں ؟ آخر کیوں ہوتا ہے اِس طرح ......

کھاٹ پر کروٹیں بدلتے رات بھیگ چلی تھی۔ ابتدائی تاریخوں کا کشتی نما چاند جلد ہی ڈوب گیا تھا اور ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ لیکن نیند اس کے قریب تک نہیں پھٹکتی تھی۔ پسلیاں چٹخنے لگیں تھیں۔ مجبوراً کھاٹ کو چھوڑنا پڑا اور باہر نکل آیا۔ سڑک کی ناگوار ٹھنڈک اس کے تلوؤں میں سے ہوتی ہوئی دماغ تک پہنچ گئی۔ اس کے دل میں نہ تو کوئی ناپاک جذبہ تھا اور نہ وہ عمداً کوئی ایسی حرکت ہی کرنا چاہتا تھا۔ جس سے اس کی ماں کے دل کو ٹھیس پہنچے۔ وہ اسے ہمیشہ اچھی اچھی نصیحتیں کیا کرتی۔ بھوک۔ قلاشی غربت کی آگ بھی اس کی شرافت کے عناصر کو شعلوں کی نذر نہ کر سکی تھی —— لیکن اس دن، کیا ہوا —— اسے نہیں معلوم کن مصیبتوں سے پانی کے نل کے ذریعے وہ

ایک خوبصورت مکان میں داخل ہؤا۔ اتنی بڑی عمارت کے قریب جانا بھی اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اسے صرف اتنا معلوم ہؤا کہ چلتے چلتے ایک جھٹکا لگا۔ ایک جھٹکا! اور اس کی زندگی کا رُخ بدل گیا۔

یہ جھٹکا ایسا آیا کہ اس کی آنکھیں جیل کی بساندھ ہی میں کھُلیں۔ جیلر غرّایا اور وُہ کانپ اُٹھا۔ جیلر کی آواز سُن کر اسے یہ معلوم ہوتا گویا اس کی گھنی اور خونخوار مونچھوں میں کئی پہاڑی کوّے ایک ساتھ کائیں کائیں کر اُٹھے ہوں ۔۔۔۔ اس کے قدم رُک گئے۔ کھٹّے کی باڑ کے دُوسری طرف اسے مکان کا وہ جستی نل دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے ذریعے رات کے وقت اس مکان میں داخل ہوتا۔ اب اس کے لئے معمولی بات تھی۔ وُہ سوچنے لگا ان بڑے بڑے محلّوں اور خوبصورت کوٹھیوں میں اکثر موت کی موشی خاموشی چھائی رہتی ہے۔ اگر اس طرح کی ایک کوٹھی اسے بھی مل جائے ــــــ تو وُہ اسے قہقہوں اور نغموں سے پاٹ دے۔

بائیں جانب انگریزی کلب کے وسیع لان تھے۔ اسے یاد پڑا کہ سولہ سترہ برس کی عمر تک وُہ اس کلب میں ملازم رہا۔

آٹھ روپے ماہوار اور دن بھر کی دَوڑ دھوپ۔ چار بجے کو آئے اور وُہ دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ گراؤنڈوں کی طرف لپکا۔ گھلے ہوئے چُونے سے لائنیں لگائیں۔ درمیان میں نٹ کھڑا کیا۔ اور وُہ نیلی نیلی سکرینیں ـــــــ اسے ان نیلے پردوں سے بڑی وحشت ہوتی تھی۔ جن کا مقصد صرف خطا ہوتی ہوئی گیندوں کو روکنا تھا لیکن انہیں کھڑا کرتے ہوئے انہیں کتنی تکلیف ہوتی تھی ـــــــ ٹینس شروع ہوئی ـــــــ وہ چار لڑکے لان میں حاضری دینے لگے اور وُہ شراب۔ لیمونیڈ لانے بازار بھاگا۔ اس سے فارغ ہُوا تو وہ بال کے چوبی فرش پر شراب کی خالی بوتلوں سے موم رگڑنے لگا ـــــــ اور اس پر آٹھ روپے ماہوار۔ لیکن وُہ اپنی بُوڑھی ماں کی خاطر سب سختیاں جھیلنے کو تیار تھا۔ بُوڑھی اور مقدّس ماں۔ جسے غربت اور افلاس کے باوجود بیٹے کے سر سہرا دیکھنے کی بڑی تمنّا تھی ؛

اس کے جسم میں بجلی کی رو دَوڑ گئی ـــــــ چار اینٹیں جو باقی رہ گئیں تھیں۔ ان کی تُرقی کی خبر اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ اسے اپنی جوانی پر شرم آنے لگی۔ ماں کا

بڑھاپا ــــــ وہ ماں کو اِس عمر میں بھی راحت نہیں دے سکا ــــــ اور پھر ندامت سے اِس کا سر جھک گیا۔

شہر کی متموّل آبادی سے گزر کر برسوں کی جانی پہچانی سڑک پر چلنے لگا۔ گندا نالہ بھی آ گیا۔ جس میں ہمیشہ سیاہ رنگ کا مواد متعفّن اور گندے پانی سے مل کر بڑی خاموشی سے بہا کرتا تھا۔ موڑے میں سے گزر کر اسے اپنا محلّہ دکھائی دیا۔ پست قد۔ غلیظ اور ٹیڑھے بینگے مکان۔ دیواروں میں خوفناک خم اور کھلی درزیں۔ بھربھری اینٹوں سے پھسلتا ہُوا گھرے باوامی رنگ کا سفوف ہر طرف سیل کی گھک۔ کوڑے پانس کے ڈھیر۔ اور ان کے درمیان ایک شکست خوردہ کوٹھڑی۔ جسے وُہ اکثر اپنا مکان کہا کرتا تھا لیکن اب ــ اب دروازہ بند تھا۔ اور زنجیر سے ایک زنگ آلود تالا لٹک رہا تھا۔

اِس کے جاننے والے بڑے تپاک سے ملے۔ جنھوں نے اس کے رہا ہونے پر مسرّت کا اعلان کیا ــــــ اور پھر یہ بتا کر اس کی ماں غنی سیٹھ کے ہاں چھوٹے موٹے کام کیا کرتی ہے اور رُوکھی سُوکھی کھا کر وُہیں پڑ رہتی ہے اور

دانت دکھا دکھا کر مسکراتے ہوئے اپنی راہ پکڑی۔ اس نے "اپنے مکان" پر حسرت آلود نگاہ ڈالی اور غنی سیٹھ کی حویلی کی جانب بڑھ گیا +

ماں کام کاج سے تھک ٹوٹ کر ایک ادھر ننگ زدہ کھاٹ پر لیٹی ہوئی تھی کہ وہ پہنچ گیا۔ یکایک ماں کے تھکے ٹوٹے نحیف جسم میں بجلی کا کوند ہوا ——— اور وہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "بیٹا۔ بیٹا۔ میرے لال۔ تم نے مجھے بہت دکھ دیا ......" اور پھر دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر چیخیں مار مار کر رونے لگی +

رات کو کھاٹ پر کروٹیں بدلتے ہوئے اس نے اپنے دل میں بار بار عہد باندھا کہ اب تو خواہ مفلسی اس کی جان لے لے پر وہ کبھی ایسی ذلیل حرکت نہ کرے گا۔ پہلے بھی اگر ماں کی نصیحت پر عمل کر لیتا تو نہ دو سال جیل ہوتی نہ مکان کی قرقی ——— جوان تھا۔ ذرا ہمت سے کام لیتا۔ وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک دو دن اُس پیٹ پر پتھر باندھ لیتا ——— کوئی نہ تو کبھی بھوکا ہی رہا ہے

اور نہ کسی کا چُولھا ہمیشہ ہی جلتا دیکھا گیا ہے ——— ہاں اب وُہ مزدوری تلاش کرے گا۔ لیکن پہلے کیا اس نے ہر دہلیز پر ماتھا نہیں رگڑا۔ کوئی مزدوری نہیں۔ مزدوری نہیں ہے .... اُچکنے .... اُٹھائی گیرے ....

اس کے کانوں میں رعونت اور تکبّر بھری آوازیں نعروں کی مانند گونجنے لگیں۔ حقائق کی تلخی زیادہ تکلیف دہ ہوگئی تو وہ فرار پانے لگا ——— اگر وُہ دو چار مہینے جُت کر مزدوری کرلے تو کھانے پینے اور کپڑے لتّے کے اخراجات کے علاوہ بھی بہت کچھ بچا سکتا ہے۔ اور ——— اگر کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ آمدنی کا کوئی مُستقل ذریعہ ہاتھ آجائے تو بہت جلد وہ اس قابل ہوسکتے ہیں کہ ایک اچھّی سی کوٹھڑی کرائے پر لے کر زندگی کر سکیں ———

اس وقت ماں کتنی خوش ہوگی۔ اسے بیٹے کے سر سہرا دیکھنے کا شوق ہے۔ پھر وہ چاہے تو کالو سقّے سے اس کی موٹے موٹے دیدوں والی لڑکی کے متعلّق بات بھی کر سکتی ہے ——— کالو سقّے کی لڑکی کا خیال آتے ہی اس کے بدن میں کئی لہریں دوڑ گئیں ——— اب تو وہ خوب جوان ہوچکی ہوگی ———

یو ــــ لڑکیاں دراصل نیم کی طرح بڑھ جاتی ہیں۔ جوان ہونے پر آئیں کمبخت تو سال بھر میں شباب بن جائیں۔

اندھیرے کے عمق سے ماں کی لرزتی ہوئی آواز آئی۔

اور اس کی فردوس کا شیرازہ بکھر گیا۔

"دیکھو بیٹا! تم نے مجھ بڑھیا کو بہت ستالیا۔ اب اگر ایسا کیا تو میں دکھ سے جان دے دوں گی"۔

"نہیں ماں۔ تم بے فکر رہو۔ میں کل سے مزدوری کی تلاش شروع کر دوں گا"۔

ماں ٹھنڈی آہ بھر کر چپکی ہو رہی۔ پھر کہنے لگی "میں تمہیں کبھی بھی رات کو باہر نہ جانے دوں گی"۔

"نہیں جاؤں گا ماں"۔

ماں نے ایک اور آہ سرد بھری۔ اور وہ تھرا اٹھا۔

دو چار دن مزدوری کی تلاش میں اس نے خون پسینہ ایک کر دیا۔ تنگ آ کر منڈی میں بوجھ اٹھانے لگا۔ گندم منڈی سے غائب تھی۔ چاول۔ جوار۔ باجرہ اور دوسری جنسوں کی نایابی کی وجہ سے منڈی کے مزدور بھی دن بھر اونگھا کرتے تاہم دن بھر کی محنت سے جتنی رقم اس کی جیب میں

جاتی۔ وُہ شام کے وقت اس کا حوصلہ پست کر دیتی۔ سیٹھ کے ہاں سے صبح و شام جھوٹے ٹکڑے مل رہے تھے۔ جوان کے لئے محض ایک سانس لینے کا "سہارا" تھے۔

ایک دن نہ جانے سیٹھ کو کیا ہُوا۔ اس نے بُڑھیا کو ڈانٹ ڈپٹ پلا دی اور کوٹھڑی کو خالی کر دینے کا حُکم دیا۔ بُڑھیا روتی ہوئی واپس ہوئی تو وُہ منڈی سے لَوٹ کر پاؤں صاف کر رہا تھا۔

"ماں۔ تو روتی ہے؟"

ماں بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی "سیٹھ کہتا ہے میرے یہاں سے اُٹھ جاؤ"۔

"کیوں؟" اس نے حیران ہو کر پُوچھا "کیا کہا ہے اِس نے؟"

"وُہ کہتا ہے۔ گھر میں جوان لڑکیاں ہیں۔ مَیں تمہارے جوان بیٹے کو یہاں نہیں دیکھ سکتا...... نہیں اس نے بڑے سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مَیں نے کچھ کہا تو گالیاں سُنا دیں —— اور دو چار دن میں کوٹھڑی خالی کر دینے کا حُکم دیدیا"۔

"دھائیں!" اس کے مُنہ پر ایک چپت لگی۔ جیسے اس نے جوان ہو کر کوئی جُرم کیا ہو۔!

مالن کو بُڑھیا کی بپتا کی خبر ہوئی تو دل ہی دل میں شک و حسد کا سارا قضیہ نمٹا کر اس سے ہمدردی جتانے آئی۔ جذبۂ ترحم نے زور پکڑا تو کہنے لگی۔

"بوا ہمارے ہوتے ہوئے بھلا تجھے فکر کس بات کی ہے۔ تجھے سر چھپانے کو ایک کمرہ ہی چاہیئے نا۔ وُہ تمہیں میں دیئے دیتی ہوں"

دو تین دن تو مانگ تانگ کر پیٹ بھرتے رہے۔ بعد میں کوئی چٹکی بھر آٹا اُدھار دینے کو تیار نہ تھا۔ گندم گوداموں سے باہر آنے کا نام نہ لیتی تھی۔ مانگے۔ گھگھیائے۔ چیخے چلائے جھوٹ بھی نہیں ملتا تھا۔ ایک دن اسے اتفاقاً مزدوری اچھی ملی۔ خوش خوش گھر کوٹا۔ رستے میں گرہ کٹ گئی ——۔

—— اس رات تو کھیل اُڑ کر بھی اس کے مُنہ میں نہ گئی۔ پانی پی پی کر دل بہلاتا رہا۔ ماں کو کہیں سے کچھ مل گیا تھا۔ وہ اسے پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا۔ فوراً عذر تراش لیا۔ اس نے جھوٹ مُوٹ کہہ دیا۔

"دس۱ بلاک سے چاول مل گئے تھے ماں۔ پلاؤ۔ گوشت۔ اور چنوں کا پلاؤ —— کتنا مزیدار تھا ——" اس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔

دروازہ بند کر کے بوریا کے موٹے گدے پر لیٹ گیا۔ ابتدائی تاریخوں کا کشتی نما چاند افق کی جانب جھک رہا تھا۔ چاندنی کے نرم نرم سینے میں اندھیرے کی غیر مرئی لکیریں پھیل گئیں۔ چاند ڈوب گیا اور رات تاریک ہو گئی۔ اس نے ٹوٹے ہوئے روشن دان سے اکّا دُکّا تاروں کو رقص کرتے ہوئے دیکھا اس کا جی چاہا کہ ذرا دیر کے لئے باہر نکلے اور سڑک پر ٹہل کر واپس لوٹ آئے۔ اسے پیٹ میں ایک ناگوار سی خلا محسوس ہوئی۔ اس کا پیٹ کسی ضدّی بچّے کی مانند کچھ اصرار کر رہا تھا ——— لیکن... ماں؟ وہ اُٹھتا اُٹھتا پھر لیٹ گیا اور سوچنے لگا باہر جانے کے لئے بہانہ تراشے۔۔

یکایک دروازے پر دستک ہوئی۔

وہ اُٹھا اور تیزی سے دروازے کی جانب لپکا۔ ماں پوچھنے لگی "کہاں چلے بیٹا" اس نے پھُرتی سے دروازہ کھولا اور دُور اندھیرے میں غوطہ لگاتی ہوئی سڑک پر بھاگنے لگا۔ موریے میں سے گزر کر گندے نالے کے ساتھ ساتھ شہر کی متموّل آبادی میں پہنچ گیا۔ اس کے اندر ایک اندھی گونگی اور بہری قوّت سمٹ آئی تھی۔ چلتے چلتے ایک جگہ ٹھہر گیا۔ قریب ہی

چوکیدار کی خوفناک آواز نے چونکا دیا ــــ رُکا ــــ لیکن اس کے قدم پھر تیز ہو گئے۔ گنجان آبادی سے نکل کر وہ کولتار کی اس دلفریب سڑک پر پہنچا۔ جس کے دورویہ خوبصورت کوٹھیاں تھیں۔ بلند مکانات تھے۔ یہاں خاموشی تھی، شکوک و شُبہات پیدا کر دینے والا سکوت ۔ اس نے لکڑی کے ایک پھاٹک کو آسانی سے پھاند لیا اور پہاڑ سا ارادہ لیئے رات کی تاریکی میں اُونگھتے ہوئے گھنے منڈھے کے گنجان پودوں کی طرف بڑھنے لگا۔ چند لمحوں میں وہ مکان کی مشرقی دیوار سے لگ کر جو اس درست کرنے لگا۔ پام اور سدا بہار کے بڑے بڑے گملوں میں سے رستہ تجویز کر کے قریب کے دریچہ کے پاس جا پہنچا۔ اور کھڑکی کے شیشوں میں سے اندر نگاہ دوڑائی

یکایک اندر کسی نے بجلی جلا دی اور وہ پام کے پیچھے سرک آیا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کوئی بڑی خاموشی اور احتیاط سے چلتا ہُوا دیوار کے قریب آکر رُک گیا۔ پھر اس نے چھڑی سے مشرقی دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ وہ چونک پڑا۔ یہ شخص چور نہیں ہو سکتا ــــ اشتیاق اور تجسس کی رُوح پھریری لے کر اُٹھی ــــ

دروازہ ایک بار کھُل کر پھر بند ہو گیا۔ وُہ جلدی سے کھڑکی کے قریب اُچک آیا۔ اور کمرے کے اندر ایک تنقیدی نگاہ دَوڑانے لگا۔ سیاہ گون پہنے ہوئے ایک نوجوان کسی —— چیز پر جُھکا ہُوا تھا۔ گون کے پھیلتے ہوئے دامن سے نکل کر ایک رنگین دوپٹہ بجلی کی روشنی میں عجیب منظر پیش کر رہا تھا دفعتاً ایک لڑکی لبادے کے نیچے سے تڑپ کر نکلی اور ایک طرف کھڑی ہو کر محجوب ہونے لگی۔ پھر اس نے نوجوان پر ایک تیز مُسکراہٹ پھینکی۔ اور کہنے لگی:۔

"چلو اُوپر کے کمرہ میں چلو ڈیر۔! ادھر کہیں نادر نہ آنکلیں"

"ایبویولاٹیک سویٹی!" نوجوان کا انداز شرابی تھا۔

کھڑکی سے کان لگائے —— اس کا خُون کھول اُٹھا۔

انتقام کا ایک ننھا سا دھبہ پھیلتے پھیلتے اسکے ہوش و حواس کے گرد محیط ہو گیا۔ اس نے ایک ہی دھکے سے کھڑکی کے پٹ کھول دئے اور کمرے کے اندر سے اُوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اُوپر سخت اندھیرا تھا۔ اس نے ٹٹول ٹٹول کر دروازہ تلاش کیا۔ لیکن دوسری طرف سے وُہ لوگ چٹخنی

چڑھا گئے تھے۔ اس نے ایک جھنجھلائے اور سپٹپٹائے ہوئے انسان کی مانند دروازے کو پیٹنا شروع کیا۔ وہ غنی سیٹھ کے مُنہ پر تھوک دینا چاہتا تھا۔ اس کے بر فاب جسم و رُوح سے طوفان اُٹھنے لگے۔ وہ اَور زور سے دروازے کو پیٹنے لگا۔

کھٹ۔ کھٹ۔ کھاٹ۔ ٹٹ۔ ٹٹ ...... کھٹ .....

وہ غنی سیٹھ کے مُنہ پر تھوک دینا چاہتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دروازہ توڑنا شروع کر دیا۔ کھٹ۔ کھاٹ۔ کھاٹ۔ ٹٹ۔ ٹٹ ...... کھٹ .... کھٹ۔ ٹٹ ....

کھڑکی

"بانو!"

"کہاں ہو۔ تم!"

آج پلاؤ۔ مرغا اور حلوہ پکے گا —— بانو چائے کا وقت ہو رہا ہے۔ اور تم لیٹی لیٹی نہ جانے چھت پر کیا دیکھ رہی ہو —— تھوڑا سا حلوہ بنا لو —— اور چھ سات انڈے اُبال کر ساتھ رکھ دو۔

"بانو یہ کیا مذاق ہے۔ وہ سب بیٹھے کھانے کا انتظار کر رہے ہیں اور تم ہو۔ نہ جانے۔ یہ تم اوندھی کیوں پڑی ہو؟ اُٹھو اب جلدی سے کھانا تیار کر دو ——

"کھانا تیار کر دو میرے دوست کے کپڑے سی دو۔"

رئیس جان بوجھ کر لاپروائی برت رہا تھا۔ اچھی خاصی آمدنی کے باوجود اس حالت میں بھی رئیس اسے کوئی ٹوٹا پھوٹا

نوکر رکھ کر نہیں دے سکتا تھا ⁂

جبکہ چپکے چپکے وہ ایک نئی زندگی کی تعمیر میں مشغول تھی۔ اس کی خاموشی سے رئیس کے ذہن میں کچھ آزادی سی آگئی۔ راتوں کی نیند بھری خاموشیوں میں روپیہ جمع کرنے کے نت نئے ڈھنگ سوچتا۔ اور دن بھر اپنی زروسیم کی ہوس بجھانے کی خاطر ہر جائز و ناجائز طریق پر کمربستہ نظر آتا۔ ایک دن رئیس نے بانو کو بتایا۔ کہ اب اُسے مکان کی بالائی منزل میں چلا جانا ہوگا۔ بانو کے استفسار پر اُس نے بات کو گول مول سا کر دیا۔ تاہم بانو اس کی نئی تجویز کو اس وقت سمجھنے میں کامیاب ہوگئی۔ جب رئیس کے پانچ چھ دوست یکے بعد دیگرے دھڑا دھڑ نچلی منزل میں اُٹھ آئے۔ رئیس نے دَوڑ دھوپ کرکے ان کے لئے ایک مُلازم بھی ڈھونڈ نکالا —— ان کے مہینے بھر کا خرچ رئیس نے اپنی جیب سے ادا کیا۔ حتیٰ کہ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو اس نے ایک مکمّل باقاعدہ اور ٹھوس بل بنا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ تو بانو رئیس کی نئی سکیم کی شق شق کو سمجھ گئی —— یہ مکان کا کرایہ۔ یہ بھنگن کا ماہانہ۔ یہ بجلی کا بل۔ یہ نل کا خرچ۔ یہ

کھانے کی لاگت ۔ یہ کپڑوں کی دُھلائی ۔ یہ رمضانی کی تنخواہ
اِس طرح اس نے اصل سے ڈیڑھ دوگنا رقم وصول کی۔ اس
کے بعد آج تک رئیس نے یہی وطیرہ اختیار کئے رکھا۔ وُہ
سب رئیس کی چالوں کو سمجھتے تو تھے۔ مگر وُہ دن ابھی ان کی
یادوں سے محو نہیں ہوئے تھے۔ جب اُن کی اکثر راتیں
ٹوٹے پھوٹے دقیانوسی ہوٹلوں میں بسر ہُوا کرتی تھیں۔ یا
باہر کھُلی فضا میں جہاں تاروں سے منڈھے ہوئے آسمان کا
سایہ ہوتا۔ اور زمین کا سپاٹ سینہ جس پر ہری ہری دوپ
ایک مخملیں فرش کی مانند بچھ گئی ہوتی ۔ اِس قدر مصائب
جھیلنے کے بعد مہینے کے اخیر میں وہ گھر بھیجنے کے لئے بہت کم
پس انداز کر سکتے ۔ خالی ہاتھ اور اپنا سا مُنہ لے کر دیس میں
جانے کی بجائے وہ پردیس کی نت نئی تکلیفوں کا مقابلہ کرنے
اور پردیس کی کلفتیں جھیل لینے کو ترجیح دیتے تھے ۔ لیکن
اب بھی جب ان کی رہائش کا انتظام ہو چکا تھا۔ انہیں ہوٹل
کے چربی اور بناسپتی گھی ملے کھانوں سے فراغت مل چکی تھی۔
رئیس کے بل کی ادائیگی ان کی یک لخت اُبھر آنے والی
اُمیدوں پر پھر پانی پھیر رہی تھیں ـــــــ

بانو کو اُن کی بے چارگی پر رحم آنے لگا۔ حالانکہ ان کی موجودگی اس کے لئے اب تک محض تکلیف اور بے وجہ کوفت کا باعث ثابت ہوئی تھی۔ وُہ ان سے سخت نالاں تھی۔ ان کے آنے سے پہلے رئیس نے اسے ہمیشہ مختصر کھانا پکانے کی تلقین کر رکھی تھی۔ بڑا تیر مارا تو ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ میں ایک بار سیر آدھ سیر گوشت لا دیا۔ ورنہ دن رات کبھی اکنّی کی دال پکتی۔ کبھی دوّنی کی پتلے شوربے والی سبزی۔ وہ رئیس کی اِس قسم کی کنجوسی کو پسند کرتی تھی یا نہیں۔ بہرحال وہ خوش تھی۔ کہ اِس طرح اسے فراغت کے کافی لمحے میسّر آسکتے ہیں۔ جن میں بیٹھ کر وہ اپنے ماضی کی جانب اڑ سکتی تھی۔ اس کا ماضی جو اس کی زندگی میں ایک سنہرے سپنے کی مانند جگمگا رہا تھا۔ اور اب کی تھکی ہوئی رُوح کے لئے حیات آفریں ماحول پیش کر رہا تھا۔ وُہ گھر کے غیر ضروری کاموں میں مشغول رہنے کی بجائے اپنے آپ کو تصوّرات کی دُھند میں کھو دینا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ جب اسے ایسے موقعے خال خال میسّر آنے لگے تو اسے ان لوگوں سے چڑ سی ہو گئی +

لیکن جونہی وُہ اپنے ذاتی معاملات سے الگ ہو کر

ان کے حالات پر نظر دوڑاتی۔ تو اس کے دل میں ایک ما درانہ شفقت عود کر آتی وہ اندر ہی اندر کڑھتی —— بل کھاتی —— لیکن —— وہ ان کے لئے کیا کر سکتی تھی ——

اور پھر رئیس کا ان بے یار و مددگار لوگوں سے سلوک —— لالچی اور بے عزّت —— اسے اپنے شوہر کو اس لقب سے یاد کر کے کوئی تکلیف محسوس نہ ہوتی —— سچ کہہ دینے سے طبیعت کی گرہ کھُل جاتی —— اور آزادی کا احساس اس کی زندگی بڑھا کر ہر شے پر حاوی کر دیتا÷

جاوید نے پنگھوڑے میں ایک دو کروٹیں لیں۔ بانو چونک کر اس کی جانب متوجّہ ہوئی۔ بچّہ پالنے میں پڑا نیند کے ہلکورے لے رہا تھا۔ بانو کے چہرے پر مسرّت کی ایک ہلکی سی لہر اُٹھی اور گالوں کے دلفریب گڑھوں میں دیر تک مدّو جزر پیدا کرتی رہی÷

جاوید رئیس سے زیادہ اس کے دوستوں کو پسند تھا۔ جو اپنی فراغت کا زیادہ حصّہ اس سے چہلیں کرنے میں بسر کر دیتے اسے ہاتھوں پر نچاتے۔ مسلتے۔ بغلوں میں گدگدی کرتے۔ ہلکے ہلکے چانٹوں سے تواضع کرتے۔ بانو دریچے میں سے

جھانکتی مگر ہول کے مارے لرز جاتی۔ پھول سا معصوم بچہ اور پانچ مشٹنڈے ایک نہ دو —— ایک دم پانچ ——
اُف —— اسے اپنے سر چکراتا ہؤا محسوس ہوتا۔ اور پھر ایک پہاڑ کی سی جسامت کے ٹھگنے۔ بادلوں کی سی گرج کے قہقہے —— اس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگتے بچے کے سامنے طرح طرح کے مُنہ بنائے جاتے۔ عجیب الخلقت بولیاں بول کر اسے خوفزدہ کیا جاتا۔ مضحکہ خیز شکلیں بنا کر اسے اتنا ستایا جاتا۔ کہ وُہ تنگ آ کر بسورنے لگتا ۔

بانو کو ایک نامعلوم سا ہَول ہر وقت احاطہ کئے رہتا۔ وہ کھڑکی سے لگ کر صحن میں ان کی انواع و اقسام کی حرکات کا مطالعہ کرتی۔ اسے دیکھ کر حیرت ہوتی۔ کہ ان لوگوں کی صحبت میں جاوید اتنا بشاش نظر آتا ہے —— کہ شاید وہ باید —— کیا اسے ان کے بے ربط۔ موٹے اور بے وضع ناک نقشے سے خوف نہیں آتا۔ بانو سوچنے لگتی —— اس کے جسم میں کئی سرد سرد لہریں دَوڑ جاتیں اور وُہ اس خنک تاثیر سے ایک بار کانپ اُٹھتی ——

جاوید نے پالنے میں کروٹ لینے کی کوشش کی۔ بانو نے

اس کے بیدار ہو جانے کے خیال سے اسے ایک ننھّا سا جھونٹا دے دیا۔ اور بچّہ پھر نیند کی گہرائیوں میں ڈوب کر ہونٹ چلانے لگا۔ جیسے عالمِ خواب میں ماں کی چھاتیوں سے دُودھ کی طاقت بخش دھارا چُوس رہا ہو۔ نیند کی مستی اور بچپن کی معصومیّت جاوید پر نُور بن کر برس رہی تھی۔ بانو کا دِل پیار اور محبّت کے احساس سے دھڑک اُٹھا۔

رئیس بانو سے روز بروز دُور ہو رہا تھا۔ دو زندگیوں کے درمیان اختلافات کی خلیج کا دہانہ لمحہ بہ لمحہ پھیل رہا تھا۔ رئیس دھن دولت کے لئے پاگل ہو رہا تھا۔ اس کے چوبیس گھنٹے اسی تگ و دو میں کٹ رہے تھے —— اس کے خواب سونے اور چاندی کے بھکے بھکے تصوّرات سے بوجھل ہو رہے تھے۔ اس نے بانو کے احساسِ لطیف میں سونا بھرنا چاہا۔ اِس کے ہلکے پھُلکے جذبات میں سیال چاندی حل کر دینی چاہی۔ لیکن بانو کی طبیعت کے ردِّ عمل نے رئیس کی خود پسند طبیعت کو پریشان کر دیا۔ اس نے رئیس کو اتنا تھکا دیا۔ کہ وُہ شکست خوردہ حالت ہی میں بانو کی دُنیا سے بھاگ نکلا —— دو زندگیاں آپس میں ٹکرائیں اور ٹکرا کر دو

مختلف سمتوں کو بڑھ گئیں۔ بانو محسوس کر رہی تھی۔ کہ وقت کے شہپر کی ایک اور عالمگیر پھڑپھڑاہٹ انہیں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے انجان بنا رہی ہے۔ وہ ساحل کو چھوڑ کر گہرے پانی میں آ رہی تھی۔ جہاں شوریدہ سَر لہروں کا شور تھا — اور پل پل اُٹھتے ہوئے طوفانوں کی گونج ——

بانو نے جاوید پر ایک اُمید بھری نگاہ پھینکی اسے اپنے شَل ہوتے ہوئے بازوؤں میں طاقت اور توانائی رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے یُوں محسوس ہُوا کہ رئیس کیا اب اگر خدا کی وسیع اور لامحدود کائنات بھی دُکھ اور رنج بن کر اس پر ٹوٹ پڑے تو وہ خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کر سکتی ہے۔ اس کے چہرے پر عزم اور استقلال کی چمک نمایاں ہو گئی +

وہ رئیس کے متعلق کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ وہ آقا معمول کے مطابق احکام کی ریل چلاتا۔ اور چیختا چلاّتا۔ شکوہ وشکایت کرتا۔ پھر نکل جاتا۔ اور بانو اس سے زیادہ کچھ محسوس نہ کر سکتی۔ کہ ایک گردباد غُل مچاتا۔ زور زور سے گھومتا۔ کھڑکیاں اور کواڑ کھٹکھٹاتا کمرے میں داخل ہوا

اور دُوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔ رئیس چند لمحوں سے زیادہ گھر میں نہیں ٹک سکتا تھا۔ یہاں اس کی دلچسپی کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔

کلاک نے ٹن سے ساڑھے پانچ بجا دئے اور بانو کا ذہن خیالات کی یورش سے آزاد ہو گیا وُہ سحر زدہ سی ہو کر اُٹھی اور کافی دیر تک جاوید کو نہلانے دھلانے مصروف رہی۔ حتیٰ کہ رمضانی بُوڑھوں کی مانند سیڑھیاں طے کرتا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح ایک بیگار میں پکڑے ہوئے انسان کے تاثرات موجود تھے۔ جو اس کی سنجیدگی کو ایک اذیّت ناک تھکاوٹ میں تبدیل کر رہے تھے۔ وُہ تقریباً رینگتا ہُوا بانو کے قریب آیا ——— ننھے کو یاد کرتے ہیں بی بی جی؟" اور بانو کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے جاوید کو لینے کے لئے بازو پھیلا دیئے ... کچھ دیر بعد بانو نے کھڑکی میں سے جھانک کر صحن میں نگاہ دَوڑائی۔ جاوید دو چار رنگین تکیوں کا سہارا لئے میز پر بیٹھا تھا۔ اور رئیس کے پانچوں دوست اس کے اردگرد نصف ہالے کی صُورت میں بیٹھے اس سے ننھی ننھی میٹھی میٹھی کر رہے تھے۔ اُمنگ بھری

راتوں اور رومان پر، ور دونوں کی مسلسل تنہائیوں سے اُکتائی ہوئی بانو کے پہلو میں دفعتاً وحشت چُٹکیاں لینے لگی۔ اور اس کا جی چاہا کہ عالمِ بے اختیاری میں چٹی نوچ کر، پرے پھینک دے اور دھم سے نیچے کُود جائے۔

بانو چٹی اُٹھا کر انہیں آزادی سے گھُورنے لگی۔ بچہ ایک بار ٹھنکا۔

"اُستاد —— دن بھر تو اکیلے اکیلے جھُونٹے لیا کرتے ہو۔ اب میز پر بیٹھنا پڑ رہا ہے تو ٹھنکتے ہو" ان میں سے ایک نے اس کے سیب ایسے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اے تیرے کپّا ایسے گال کس پر گئے۔ تیرے باپ کا مُنہ تو چُوسے ہوئے آم کی طرح ہے۔ نرا گھسیارا ہے تیرا باپ —— چنگڑ —— بول بیٹا کیا غلط کہا ہم نے —— کس پر گیا ہے تُو ——؟"

"باپ پر نہیں تو ماں پر —— ارے کہہ بھی دے بدمعاش نمونے کے طور پر دو دانت کیا دکھا رہا ہے ہمیں"۔

ایک اور بچے پر پل پڑا۔ اور ساتھ ہی جبڑے کھول کر اپنے مُنہ کا پُورا پھیلاؤ اس کی آنکھوں کے سامنے لے آیا۔

"دیکھو اُستاد پُورے بتّیس دانت ہیں مُنہ میں"۔

جاوید خوفزدہ ہو کر چیخنے لگا۔ اور وُہ سب کے سب اس زور کھلکھلا اُٹھے۔ کہ جاوید کی آواز اس کے حلق میں دب کر رہ گئی۔ "ہُوں اب سمجھے تُو تو اپنی ماں پر گیا ہے۔ یہ گپّا سے گال۔ جیسے ہوا سے بھرے ہوئے بلیڈر۔ یہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں جیسے بلوری بنٹے۔ ارے کیا ایسی ہی ہے تیری ماں۔ جبھی تو چھپ چھپ کے رہتی ہے ہم سے۔ ہماری ماں ایسی ہے ...... "

تکیوں کا سہارا لئے جاوید کی معصوم نگاہیں کھڑکی سے ٹکرائیں وُہ ماں کو اپنی نگاہ کی زد میں پا کر کلکاریاں مارنے لگا اسے ہنہناتے دیکھ کر سب کی نگاہیں یکبارگی کھڑکی جانب اُٹھیں۔ بانو کے رنگ دوپٹے میں گھبراہٹ کے مارے کھٹاس بھر گئی اور اس نے جلدی سے چق چھوڑ دی۔

بانو کے کانوں میں دیر تک اُن کی کھسر پھسر بھنبھناتی رہی اور پھر جاوید کے بسورنے پر اس بجھتی ہوئی بھنبھناہٹ میں زندگی آگئی۔ قہقہے پھر دیواروں سے سر پھوڑنے لگے۔ اور جاوید کے ہاتھوں پہ نچا نچا کے خُوب شور مچایا جانے لگے۔

بانو پھر چق سے لگ گئی۔ اور اس طوفانی بدتمیزی سے لطف اندوز ہونے لگی۔ لیکن اب اس غل غپاڑے میں تصنع تھا۔ پھسپھساپن تھا۔ وہ جیسے صرف اس لئے غل مچا رہے تھے کہ بانو چق اٹھا کر ایک بار پھر دیکھے کہ نیچے کیا ہو رہا ہے۔ کیوں شور مچایا جا رہا ہے۔ دھیان کسی ایک کا بھی جاوید میں نہ تھا۔ جاوید اس کھوکھلے غوغے سے تنگ آ کر رونے لگا۔ تو انہوں نے اسے اپنے ملازم کے ہمراہ اوپر بھجوا دیا۔

بانو چق کے قریب کھڑی کھڑی دیر تک سوچتی رہی۔ وہ سب لاکھ بے وضع سہی لیکن دل کے وضعدار ضرور رہیں۔ رئیس کا بے داغ ناک نقشہ —— ان چیزوں کے مقابلے میں وہ چہرا کس قدر مکمل اور خوبصورت ہے۔ لیکن اس کی سفید اور حسین کھال کے نیچے سانس لینے والی روح ...... اس کی طبیعت میں رچی ہوئی ہوس ...... جو اسے ہر شخص سے غیر انسانی برتاؤ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ آخر کیا ہے ان دونوں میں مطابقت؟ بانو دیکھ رہی تھی کہ رئیس کے مقابلے میں وہ کس خوبی سے اس کے معیار انسانیت پر پورے اتر رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ان کے خود فراموشانہ

پتھروں سے خوف کھا رہی تھی۔ ان کی آنکھوں سے نگاہ کے تار نہیں۔ شعلوں کی ہانپتی ہوئی زبانیں نکل رہی تھیں۔ چھت کی جانب یوں بڑھتیں جیسے چھت اور چھت کے پیچھے کی شے کو جلا کر راکھ کر دیں گی +

تاہم ان کی آنکھوں میں ایک پکار تھی۔ ایک چیخ۔ بانو اس پکار کو سُن رہی تھی۔ چیخ کو سمجھ رہی تھی۔ بانو کے دل سے خوف کا احساس جذبۂ ترحم میں حل ہو کر رہ گیا۔ اور وُہ دیر تک اِس بات کا اندازہ لگاتی رہی کہ اسے ان لوگوں سے کِس قدر ہمدردی ہے۔ اُف بے چارے ـ ـ!

اُس نے جاوید کو بستر سے اُٹھا کر گود میں لٹا لیا۔ اور اس کے باریک سنہرے ریشمی بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ معاً اسے اپنے ذہن میں کسی دھماکہ سے پھٹ جانے والے بم کی گڑگڑاہٹ سُنائی دی۔ جاوید کے معصوم اور خوبصورت چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے اُسے ایک عجیب سا احساس ہوُا۔ اسے یوُں محسُوس ہوُا۔ کہ وُہ جاوید کو شادی کے ان اڑھائی تین برسوں سے بہت پہلے کی جانتی ہے ـــــــــ وُہ اس معصُوم اور پھُول سے

نازک بچّے سے کس قدر مشابہ تھا۔ جو نہ جانے کب سے اس کی کم فہمی کے پالنوں میں کلکاریاں مار رہا تھا۔ وہ چھوئی موئی کا پودا جسے سمٹنے اور مُرجھانے کے لئے صرف کسی اجنبی اور انجان ہاتھ کے لمس کی ضرورت تھی۔ ابھی تک اس کی کشتِ حیات میں اسی کنوارپن کے مراحل طے کرتے ہوئے لہلہا رہا تھا۔ وُہ پھُول سا نازک بچہ جو بالکل جاوید سے مشابہ تھا۔ جو اُس کے ہوش سنبھالنے کے وقت بھی ایسا ہی معصوم اور ایسا ہی نازک تھا۔ اور آج کئی برس گُزرنے کے بعد ــ شادی کا سا انقلاب دیکھنے کے بعد بھی ویسا ہی نزاکت کا پیکرِ جمیل تھا۔ جسے رئیس کے علاوہ اس کی صنف کا ہر ہاتھ محض ایک حرکت سے توڑ سکتا تھا۔ وہ خوبصورت کھلونا ــــــــ

بانو کے جسم میں خوف و ہراس کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر ایک دُوسری میں اُلجھنے لگیں۔ مگر اسے اپنی اور رئیس کی زندگی میں حائل شُدہ بے شمار اختلافات کا خیال آیا ــــ اسے رئیس کی کوئی حرکت پسند نہ تھی۔ اس کے عام روّیے سے سخت بددل تھی اور روزمرّہ کے سلوک سے سخت نااُمید!

پھر یکایک بانو کو اپنی پڑوسن کا خیال آیا اور وہ دِل ہی

دِل میں اِسے کوسنے دینے لگی ''حرامزادی ـــــ کُتنی کہیں کی ـــــ سَو چُوہے کھا کر پھر پاک دامن کی پاک دامن۔ دُنیا بیتے ہوئے دنوں کو بہت جلد بھُول جاتی ہے۔ اب کسے یاد ہے کل اِس چھوٹی نے کیا کیا گُل کھلائے'' بانو بے اختیار رسی ہو کر رونے لگی ـــــ ''رئیس کی فطرت محبت اور انسانیت سے کس قدر دُور ہے۔ اس نے آج تک روپے پیسے کے علاوہ کسی اور چیز کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے یاد تک نہیں۔ کہ اس نے ایک معصوم جان کو گھر کی چار دیواری میں دم گھُٹ ہونے کے لئے بند کر رکھا ہے۔ اسے رئیس کے ان دوستوں کا خیال آیا۔ جن میں سے ہر ایک کی بیوی کی حالت اس وقت بانو کی سی تھی ـــــ

مشابہت کا یہ احساس پانچ مُشٹنڈوں کی صُورت میں عجیب عجیب رُوپ دھا کر اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا ـــــ پانچ مُشٹنڈے ـــــ زور زور سے قہقہے لگانے لگے، اُن کی لمبی لمبی خُونخوار موچھیں ـــــ بڑے بڑے وحشی جبڑے۔ قوی جُثے۔ اس کے ہوش و حواس پر چھانے لگے۔ لوہے کے مُگتے۔ اس کے تھکے ٹُوٹے جسم پر اودھم مچانے لگے۔

بانو ڈر کے مارے آنکھیں میچ لیتی۔ یکایک اسے ایک ننھی سی جگر پاش چیخ سنائی دی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ چیخ اس کی اپنی رُوح کے پاکیزہ سینے سے بلند ہوئی ہے۔ ایک معصوم اور نازک بچے کے حلق سے بلند ہونے والی چیخ —— بانو تھرا گئی۔ کانپ اُٹھی جیسے اس کی زندگی کے بے داغ اوراق پر نہایت کریہہ المنظر اور ہیبت ناک خاکہ پھیل رہا ہو۔ ایک دو لمحوں کے بعد اس کے جسم کی تھرتھری ایک گہری سوچ میں تبدیل ہو گئی۔ وہ دیر تک اپنے خیالات میں غرق رہی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بچہ جسے وہ بچپن سے جانتی ہے۔ اس کے لئے چیخ چیخ کر خاموشی اختیار کر لینا ازحد ضروری ہے —— دُنیا بیتے ہوئے دنوں کو جلد بھُول جاتی ہے۔ آج کے بعد اس بچے کی موت خواب و خیال ہو کے رہ جائے گی؟ یہ معصوم جان اس کے لئے کس قدر تکلیف دہ ثابت ہو رہی ہے۔ وہ ہر وقت رُکی رُکی سی رہتی ہے۔ رُکی رُکی اور دبی دبی۔ وہ پرندوں کو فضا میں آزادی سے پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھتی۔ تو اس کے بازو انگڑائی لینے کے انداز میں لہرا اُٹھتے جیسے وہ ابھی آسمان کی جانب پرواز کر جائے گی۔

وہ اس معصوم بچّے کی موجودگی سے بے نیاز ہو جانا چاہتی تھی۔ اور اس کی ہستی سے بے خبر!

وہ دن رات ایک معصوم بچّے کی درد بھری چیخوں کو سن رہی تھی۔ اس کے ٹوٹتے ہوئے دم اور چھوٹتی ہوئی سانس کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کے باوجود جونہی وہ لوگ دفتر سے واپس ہوتے تو ان کی ہر چھوٹی موٹی فرمائش کا خیال رکھنے لگتی۔ ساڑھے پانچ کے قریب اپنا پانی کا نل بند کر دیتی تا کہ ان کے نہانے دھونے کے لئے کافی مقدار میں پانی مہیّا ہو سکے۔ کوئی اچھی چیز تیّار ہوتی۔ تو ان کا حصّہ فوراً الگ کر دیتی...... اِس کی سب حرکات عقل کی سطح سے بلند ہو کر محض مشین بن کر رہ گئی تھیں۔

بار بار کی کھینچا تانی سے پُرانی اور بوسیدہ چق کئی پنیلوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ شگاف پیدا ہو رہے تھے۔ بانو نے چق اُتار کر رمضانی کے ہاتھ بازار میں مرمّت کے لئے بھیج دی ——— اور اب کھڑکی ننگی تھی ——— بالکل ننگی ——— !

چق کی عدم موجودگی بانو کے لئے ایک دلچسپ سی

اجنبیت کا احساس فراہم کر رہی تھی ـــــ وہ بار بار کھڑکی کے قریب کھڑی ہو کر وسیع اور نیلگون آسمان پر آزادی سے نگاہ ڈالتی۔ اور دُوسری پھسلتی ہوئی نگاہ سے شور و غل سے اَٹے ہوئے صحن کا جائزہ لیتی۔ انہیں باتیں بناتے صحن میں چھڑکاؤ کرتے دیکھتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ اس کے بعد جب رمضانی اُوپر آ کر جاوید کو ساتھ لے گیا ـــــ تو معمول کے مطابق محفل جم گئی۔ جاوید کو چوکولیٹ اور کھلونے پیش کئے گئے۔ بانو کھڑکی کے بائیں پہلو سے لگ کر ایک ترچھے زاویئے سے انہیں دیکھنے لگی۔ جاوید کسی قسم کا ملال قبول کئے بغیر ان کے سب کھیلوں میں شریک تھا۔ آج ان کی بذلہ سنجی شباب پر تھی۔ حرکتوں میں والہانہ پن۔ اور ایک خود ساختہ امتیازی شان۔ آہستہ آہستہ بانو قطعی طور پر ان کی نگاہوں کی زد میں آ گئی۔ وہ اِس انقلاب پر حد درجہ متعجب تھے۔ اور بانو کی اس نوازش پر بہت ہی خوش۔ وہ محسوس کر رہے تھے۔ کہ دو اڑھائی برس پردیس میں رہنے کے بعد وہ دفعتاً اپنے گھر آ گئے ہیں۔ جہاں انہیں گھریلو زندگی کی تمام مسرتیں حاصل ہیں ـ اور

روز مرّہ کے تمام لوازم انہیں میسّر ہیں۔ بانو ان کے اس قدر قریب آ چکی ہے۔ کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس گھر میں بیگانگی محسوس نہیں کرتے +

کھڑکی صحن سے قریب آ رہی تھی۔ بلندی کم ہو رہی تھی۔ پستی اُبھر رہی تھی۔ نشیب و فراز اُبھر، اور دب کر ہم سطح ہو جانا چاہتے تھے۔ رسمی حجابات اُٹھ رہے تھے۔ اور اب انہیں آپس میں ایک گھریلو قسم کے رشتے کا احساس ہونے لگا۔ جو بڑھ کر بے تکلّفی کی حد و دتک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مگر بانو کی سنجیدگی نے انہیں ایک حد سے متجاوز ہونے کا کبھی موقع نہ دیا +

ایسی ہی ایک خوشگوار شام کو بانو کھڑکی میں کھڑی تھی۔ کہ ان میں سے ایک نے اسے جاوید کی اُنگلی کا نشانہ بناتے ہوئے زور سے کہا "وہ —— تیری ماں ——" بانو اس فوری شرارت پر بوکھلا گئی۔ اور تقریباً لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے ہٹی۔ اس نے جاوید کو دونوں ہاتھوں سے جھلا کر ہوا میں اُچھال دیا "چل بھاگ اپنی امّی کے پاس ——" بانو پیچھے ہٹتے ہٹتے رُک گئی —— اس کے ہونٹوں کی کمانوں سے ایک چیخ تیر کی مانند زن سے نکل گئی۔ جاوید فرش پر گرتے

گرتے بچا —— وُہ خوفزدہ ہو کر بے طرح چلاّ رہا تھا۔ بانو دیوانوں کی مانند سیڑھیاں طے کرتی ہوئی نیچے آئی۔ اور جاوید کو سینے سے لگا کر اسی وارفتگی سے کھٹ کھٹ پھر چڑھ گئی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بجلی کا ایک کوندا ہُوا۔ آنکھیں چُندھیا گئیں اور بس —— وہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ کہ انہوں نے بابو کو کبھی قریب سے بھی دیکھا ہے اور بانو محسوس کر رہی تھی کہ وہ موت کے دہانے میں کُود کر اپنی رُوح کی شادمانیوں کو سینے سے لگا کر پھر زندگی کی حسین سطح پر اُچھل آئی ہے۔ اس کے پُرشور جذبات کی ندی ایک بار پھر اپنی گزرگاہ تبدیل کرنے لگی ——

رات کو سوتے میں رہ رہ کر اس کی نگاہوں کے سامنے وہ لمحات ایک ہولناک منظر کی صُورت میں پھیلنے لگتے۔ جب جاوید پتھریلے فرش پر گر کر اپنے انجام سے پٹنے لگا تھا۔ وہ سوچتی۔ اگر ایک لمحہ کا تغافل جاوید کو اُس سے دُور —— کہیں دُور لے جاتا۔ تو اس کی حالت —— اس کا مستقبل کیا ہوتا —— اِس کے جسم پر بار بار لرزہ طاری ہو جاتا —— نیند کی ہلکی پھُلکی لہریں۔ ڈر اور خوف کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر منتشر ہو جاتیں۔ اور وُہ پاگل سی ہو کر نیند میں مدہوش جاوید کو اپنے سینے سے چمٹا لیتی۔ اور بے تحاشا اُسے

چُومنے لگ جاتی ـــــــ

رات کافی بھیگ چُکی تو اسے کچھ اطمینان نصیب ہُوا۔ چاندنی کی نُورانی کرنیں کھڑکی میں سے چھن چھن کر فرش پر ناچ رہی تھیں۔ بانو نے بائیں کُہنی کے بل اُٹھ کر جاوید کے مُکھڑے پر نگاہ ڈالی۔ اور سوچنے لگی۔ جاوید کس طرح مطمئن ہے ـــــــ مطمئن اور پُرسکون ـــــــ بانو کو اپنے پہلو میں سکون کروٹیں لیتا ہُوا محسوس ہُوا +

اس کا مستقبل کس قدر تاریک ہو رہا تھا۔ اور ایک عورت کا تاریک مستقبل اُسے کئی ایسے چہرے یاد تھے۔ جو ایک بار بھٹک کر ہمیشہ کے لئے اپنی قسمت کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے کھاتے مرجھا چکے تھے۔ انہیں اپنی زندگی کو جگمگانے کے لئے ایک ہلکی سی شُعاع بھی نصیب نہ ہو سکی۔ اُسے اپنی کم نصیبی پر افسوس ہونے لگا۔ کھڑکی صحن سے کس قدر بلند تھی۔ وُہ اس ہوشربا بلندی سے گر رہی تھی۔ اگر وُہ واقعی اتنی بلندی سے گر پڑتی +

بانو نے جاوید کو تشکر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے سینے سے چمٹا لیا۔ جیسے اس نے اسے کھڑکی سے گرنے سے بچا لیا ہو ـــــــ !

کاش آپ نے فلسفہ پڑھا ہوتا

راہبر لطیف کو اشارے سے بتا رہا تھا۔ وُہ رہا ہیپی ہاؤس۔ وہ ایک سرسبز و شاداب پہاڑی کی دائیں بغل کے قریب اُبھری ہوئی ایک بڑی سی چٹان پر دیو دار کے ان بلند درختوں کے بیچوں بیچ، وُہ خوبصورت گھروندا جیسے معصوم پریوں کا ننّھا سا گھر، لطیف پُوچھنے لگا۔ "بھئی آج کل میں پہنچ جائیں گے وہاں"۔ راہبر میدانوں کا کوئی دیہاتی تھا جس نے عُمر کا باقی حصہ چٹانوں سے گھرے ہوئے اس خطّے میں گزار دینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ "بس جی وہ سامنے تو ہے۔ مُرغے کی ایک اُڑان"۔ چڑھائی شروع ہو گئی۔ لطیف کا ٹٹّو لگ بھگ ریاں کرنے لگا۔ راہبر کی ٹخ ٹخ میں سختی آ گئی۔ ٹٹّو مُنہ کا کڑوا تھا۔ ایک بار جو دولتی چلائی تو لطیف گرتے گرتے بچا۔ اور چلّا اُٹھا "تم بھی عجیب انسان ہو۔ ایسا جاہل ٹٹّو باندھے

میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ٹھیرو مجھے اُترنے دو۔ سامان اس پر لادلو۔ میں ایسے ہی چلوں گا۔"

لطیف نے وقت دیکھا۔ گھنٹہ بھر سے پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ اور ابھی چڑھائی ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ ہیپی ہاؤس کبھی تو بالکل سامنے دکھائی دینے لگتا۔ اور کبھی چٹانوں اور درختوں کی اوٹ میں ایسا غائب ہوتا۔ کہ بہت دیر تک کہیں بھی دکھائی نہ دیتا۔۔۔۔۔ چڑھائی نے اس کا بند بند تھکا دیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ کسی جگہ شکستگی کے عالم میں گر پڑے اور لمبی تان سو جائے۔ چلتے چلتے راہبر کہنے لگا۔ دیکھئے سرکار، کتنا خوبصورت منظر ہے۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی اسے پسند کریں گے۔ یہ جگہ میری محبت کی یادگار ہے۔ وُہ رُک گیا۔ اور ایک لمحہ کے توقف کے بعد کہنے لگا۔ چیڑ کا وہ معمّر تنا مجھے بہت عزیز ہے ہم لوگ نیم درازی کی حالت میں اسے تکیہ بنائے دیر دیر تک باتیں کیا کرتے۔ ہمارے قہقہے آزاد تھے۔ بالکل آزاد۔ جو کبھی اس چٹان سے اُلجھتے، کبھی اس پہاڑی سے اور پھر اُچھلتے کودتے ہماری طرف واپس چلے آتے۔ چشمے کا دندناتا ہُوا پانی۔

ہوا میں جھومنے والے پیڑ۔ پہاڑوں کی گود میں بہنے والا دھارا۔ سبھی میرے دوست ہیں۔ جس وقت میں یہاں سے گزرتا ہوں وہ سب میری جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ محبّت کے میٹھے میٹھے گیت ایک بار پھر سُننا چاہتے ہیں وہ مجھے دعوت دیتے ہیں۔ شاید کہتے ہیں "آؤ آؤ ہماری گود میں لیٹ کر ایک بار پھر نغمۂ محبّت گادو۔ لیکن بابو جی وقت کی بات ہوتی ہے۔ وُہ دن بیت گئے۔ جب جگر میں بوتہ تھا۔ اور رگوں میں خُون۔ پر دل سے کون سمجھے اِس واقعہ کو دس پندرہ برس ہونے کو آئے۔ لیکن وطن جانے کو جی نہیں چاہتا..." لطیف کی تکان دُور ہونے لگی۔ تعجب کے احساس نے تکلیف پر غلبہ پالیا۔ وہ سوچنے لگا "ایسا مفلوک الحال شخص بھی جذبات، رومان اور محبّت کا سرچشمہ بن سکتا ہے"—— "اس کا نام کیا تھا" لطیف نے راستہ کاٹنے کی خاطر پوچھ لیا "ریشماں سرکار"...."تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وُہ مرچکی ہے"..."زندہ ہے۔ لیکن میں اسے مُردہ ہی سمجھتا ہوں۔ میرے لئے وُہ کب کی مرچکی ہے" لطیف کی طبیعت گھبرانے لگی۔

وہ سوچ رہا تھا۔ اگر اس شخص نے فلسفہ پڑھا ہوتا۔ تو ہرگز اِس حال کو نہ پہنچتا۔ ایک لڑکی کے لئے اتنی سر دردی؟ درخت، چشمے وغیرہ حضرت کو دعوت دیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ضرور اس شخص کا دماغ خراب ہے۔" اونہہ چھی۔ ٹٹو کی بات کرو۔ کب کا لدّو نکل چکا ہے۔ مُنہ سے تو دُودھ کی بُو آتی ہے۔ کھرا پن طبیعت میں زیادہ ہے۔ دولتّیاں جھاڑنے کا مشتاق ہے۔ تم بھی جاہل۔ تمہارا ٹٹو بھی۔ تم ہیں اور اس میں کیا فرق ہے۔ جب ٹٹو نے میرا سامان نہیں اُٹھا رکھا تھا۔ تم نہایت آسانی سے پیٹھ پہ لادے چلے آرہے تھے۔ تم دونوں ٹٹو ہو۔ کرائے کے ٹٹو۔ اس کے لئے ہنکنے کی ضرورت ہے۔ تمہارے لئے پیسے کی جھلک گی۔ اب خاموش رہو۔ اور یہ ٹٹو بیچ دو۔ بالکل جاہل ہے"۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ اور وہ بل کھاتے ہوئے پتلے سے راستے پر چلتے رہے۔ راہبر پُوچھنے لگا "اِن سُوٹ کیسوں میں کیا ہے۔ سرکار چھوٹے سے ہیں۔ پر ایسے بوجھل کہ جیسے لوہے سے بھرے ہوں"۔ ...... اِس سوال کا جواب کیا دُوں۔ جو میں خود بھی نہیں جانتا۔ اگر یہ پُوچھو کہ اس

بیگ میں کیا ہے۔ تو مَیں تمہیں بتاؤں کہ اس میں فلسفہ بند ہے ——— اب پُوچھو گے فلسفہ کیا۔ فلسفہ ٹٹّو ہے ٹٹّو۔ عقل کے ہنکیئے کے اشاروں پر چلتا ہے۔ بڑی بڑی کٹھن چڑھائیاں طے کر جاتا ہے۔ لیکن عموماً دلدل میں پھنسا رہتا ہے.... "دلدل میں".... "ہاں دلدل میں جان بُوجھ کر۔ اِسی لئے کرائے کا نہیں۔ کام کرتا ہے اور بالکل مُفت نہیں کرتا تو ہزار جتن کر دیکھو۔ کیا مجال جو ٹس سے مس بھی ہو جائے"!

"بابو جی سیانے کہتے ہیں۔ کام نکل آئے چاہے اس کی کوئی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اِس لحاظ سے تو میرا ٹٹّو ہزار درجے اچھّا ہے..... لطیفؔ ذرا دیر کے لئے لاجواب ہُوا۔ تو کہنے لگا" بس چُپ رہو۔ باتیں مت بناؤ"!

"آپہنچے صاحب" راہبر نے ایک گہرا سانس لیا۔ لطیفؔ نے دیکھا ہیپی ہاؤس درختوں کی اوٹ سے نکل کر اب بالکل قریب دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی پُر فضا جگہ تھی۔ لیکن لطیفؔ بنگلے کی دلکشی یا ماحول کی کھُلی ہوئی شاعری سے متاثر نہیں ہو رہا تھا۔ وُہ یہ دیکھ دیکھ کر

خوش ہو رہا تھا۔ کہ وہاں پر کئی ایسی جگہیں موجود تھیں۔ جہاں اگر دن بھر کتابیں ہی کتابیں پڑھی جائیں تو کوئی بھی روکنے ٹوکنے کی غرض سے تلاش نہ کر سکے۔ سورج کافی چڑھ آیا تھا۔ لیکن بلندی پر خوشگوار ہوا کی پٹیں عجیب خوشگوار ماحول پیدا کر رہی تھیں۔ باجی برآمدے کے سامنے والے چبوترے پر کرسی میں دھنسی سویٹر بُن رہی تھیں۔ دیکھتے ہی چیخ اُٹھی وہ لطیف بھیّا" .... کسی نوکر کو بلاؤ سامان ٹھکانے لگائے۔ اور ہاں اِس ٹٹّو والے کو کچھ دلوا دو"....

کچھ دیر سستا کر لطیف اُٹھا اور مکان کا جائزہ لینے لگا مکان امید سے بڑا تھا۔ ہیپی ہاؤس کے مکین تقریباً سبھی غائب تھے۔ میدان کے ان ترسے ہوؤں کا اور کام ہی کیا تھا۔ کہ قدرت کی بافراط نعمتوں کے درمیان گدکڑے لگاتے پھریں کھانا پینا، ہنسنا بولنا اور غائب رہنا۔ اس کے علاوہ انہیں اور کچھ سوجھتا ہی نہ تھا شکم پری ہوئی تو خانہ پُری غائب۔ پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تو پھر گھر۔ اس وقت بھی چند ایک کو مستثنےٰ قرار دیتے ہوئے سب

جمع غائب کی گردان کر رہے تھے۔ مُلازمین کے علاوہ گھر کے چند ایک افراد کی موجودگی بھی لازمی تھی۔ اِس لئے کہ کھانے وغیرہ کا انتظام ٹھیک وقت پر ہو جائے۔ ورنہ باہر سے آنے والے جس قسم کی بھُوک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اِس کے پیشِ نظر شاید یہ کہنا بجا ہوگا۔ کہ اگر انہیں چھُوٹتے ہی کھانے کی ٹیبل لگی ہوئی دکھائی نہ دے تو میز کو ہی کھا جائیں۔

لطیف ایک چھوٹے سے صحن کی طرف جا نکلا۔ آرام کُرسی پر دراز ایک خاتُون مطالعہ فرما رہی تھی۔ بشرے پر کمسنی اور معصومیت کھیل رہی تھی۔ انہوں نے کتاب سے نگاہیں اُٹھائیں۔ زوم، زدم، زن، دھڑام وہ بیہوش ہوتے سنبھل گئیں۔ اور پھر زور زور سے چیخنے لگیں۔ شور سُن کر لطیف کے تو ہاتھ پاؤں بھُول گئے۔ لیکن ایک نوکر اور تین چار لڑکیاں تیزی سے صحن میں داخل ہوئیں۔ نوکر نے بڑھ کر پُوچھا۔ ”کیوں صاحب آپ کون ہیں۔ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں؟“

”مَیں؟ مَیں لطیف ہُوں . . . .“ فضلو نے آس پاس

تین چار نازک اندام اور سہمی ہوئی لڑکیاں دیکھیں تو نوجیوں کی مانند اکڑ کر اور عقل کو باورچی خانے میں دم پخت ہونے کے لئے بھیج کر کہنے لگا "یہی تو میں پوچھتا ہوں کہ آپ لطیف کیوں ہیں؟" لطیف گھبرا گیا اور اسی لڑکی سے مخاطب ہوا "کیسے کیسے حیوان ...... ابھی دُنیا میں باقی ہیں۔ کہتا ہے کہ آپ لطیف کیوں ہیں۔ خواتین اِس سے پہلے کہ کوئی بڑا عجیب حادثہ پیش آ جائے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ممکن ترین قلیل عرصہ میں آپ سے متعارف ہو لوں۔ آپ کی اطّلاع کے لئے ایک جنرل اعلان کیا جاتا ہے۔ کہ خاکسار کو باجی رشیدہ کا چھوٹا بھائی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ فخر نہیں شرف حاصل ہے۔ اور خاکسار ابھی ابھی بذریعہ ٹٹّو ہیپی ہاؤس میں وارد ہوا ہے" اِن سب کے چہروں پر مسکراہٹیں پھیل گئیں۔ بے تکلّفی نہ تھی ورنہ اس عجیب و غریب تقریر پر داد دیے کرنے کے لئے وہ لوگ بالکل تیار تھے۔ باجی آئیں تو دو چار باتیں بنا کر لطیف کو ساتھ لے گئیں لطیف کہنے لگا "اتنے بڑے مکان میں ـــــ کیوں باجی ـــــ ایک بھی کمرہ ایسا نظر

نہیں آیا۔ جس پر خالی ہونے کا شُبہ کیا جا سکے۔ ہمیں کوئی کیوبیکل ملے گا۔ یا ڈارمیٹری اتنی بات یاد رہے کوئی الگ تھلگ کمرہ ہو۔ ورنہ پہاڑ واڑ کا مزا سب کرا کرا ہو جائے گا۔ تم لوگ سارے کا سارا محلّہ ہی پہاڑ پر چڑھا لائے ہو۔ یہ کیا مذاق ہے آخر —— تمہارا بستر کہاں ہے؟" "بستر! واہ بستر کیوں لاتا۔ پرائے گھر جا رہا تھا کیا؟" —— "تو اب رات کو سردی میں چلّہ ہی کاٹا کرو گے۔ یہاں پر کوئی فالتو بستر نہیں۔ اور بھی بہت کچھ لکھا تھا اماں جان نے۔ وہ تو لے آئے ہو نا ——" "اجی ایک ایک چیز۔ سُوٹ کیس سر بھر پڑے ہیں۔ اس بیگ میں میری کتابیں ہیں۔" باجی نے سُوٹ کیس کھولے۔ دونوں ہی کتابوں سے ٹھسا ٹھس بھرے پڑے تھے۔ اب باجی لطیف کی جانب اور لطیف باجی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "یہ کیا!" باجی نے پُوچھا . . . . . . "سچ تو یہ ہے۔ باجی میں خود بھی نہیں جانتا۔ غلطی سے یہ لے آیا ہوں میں نے کھول کر بھی نہیں دیکھے تھے۔ لطیف کو باجی کے چڑ جانے سے مسرّت سی محسوس ہو رہی تھی۔ کہنے لگا "باجی حالات سازگار ہیں۔

خُدا کے فضل سے خُوب پڑھیں گے۔ خدا کے فضل سے خوب پڑھیں گے۔ رات کو سردی کے مارے نیند تو آئے گی نہیں بس کتابیں ختم کیا کریں گے۔ کیوں کیا خیال ہے......"

رات کے کھانے پر ہاتھ صاف کر چکا تو دل ہی دل میں کوئی پروگرام مرتّب کرنے لگا۔ رفیق ارشد۔ محمود ناگہانی طور پر اندر ٹپک پڑے۔ ارشد نے ستار تھام رکھا تھا۔ چھُوٹتے ہی بول اُٹھا "ہال میں تشریف لے چلئے صاحب۔ ہم آپ کو سینما دکھائیں گے۔ ستار پر نغمے سنوائیں گے ــــــ" لطیف نے ستار کی طرف بڑے مضحکہ خیز انداز سے دیکھا "میاں ارشد آرٹ کی نعش کیوں بغل میں دبائے کھڑے ہو۔ بھئی کچھ ہوش کی دوا لو۔ ستم بر بالائے ستم اس کو بجانے کی لعنت بھی تمہارے سر ہے۔ بیٹھو کوئی کام کی بات کرو۔ آرٹ قوموں کو تباہ کر دیتا ہے۔ ہندوستان سے مغلیہ جیسی باوقار سلطنت اِس لئے ختم ہو گئی۔ کہ غالب سے عظیم المرتبت شاعر" کیا ڑخانوں سے نکل کر عوام کے دلوں میں گھر کر گئے۔ اور ذوق سے بھڑ بھونجے درباروں میں رسُوخ حاصل کر گئے"۔ لیکن اس وقت فضا بڑی مختلف

تھی۔ مجبوراً لطیف کو ان کا ساتھ دینا پڑا۔ ہال بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ سامنے پست قد میزوں کی سٹیج پر سفید سکرین مُسکرا رہی تھی۔ وُہ لطیف کو کھینچتے ہوئے سٹیج پر لے گئے۔ ظہیر۔ سلیم۔ انور۔ لطاف۔ جاوید۔ پرویز پہلے ہی سے وہاں بیٹھے بڑے بھیانک قہقہے لگا رہے تھے۔ شمیم آمنہ۔ نجمہ۔ عصمت۔ منور۔ امتل ہال میں داخل ہوئیں۔ رفیق نے سٹیج پر سے خاموشی کی اپیل کی۔ سب لوگ ترتیب سے بیٹھ گئے۔ رفیق کہنے لگا "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! سینما یا میوزک پروگرام سے پہلے ہم ایک اور پروگرام پیش کریں گے۔ غالباً آپ خوب سمجھتے ہوں گے۔ کہ میرا اشارہ مسٹر لطیف کی ذات سے ہے۔ آپ آج ہی صبح بذریعہ ٹٹو تشریف لائے ہیں۔ آپ ـــــ یونیورسٹی کے ذہین ترین طُلبا میں سے ہیں۔ آپ نے اپنی ساری زندگی الو کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے وقف کر دی ہے ....." لطیف گھبرانے لگا۔ حاضرین میں سے ایک نے لَے اُٹھائی "کُند ہم جنس با ہم پرواز ......" رفیق نے پھر خاموشی کی اپیل کی۔ اور کہنا شروع کیا "اِس سے پہلے کہ ہم شو شروع کر دیں لطیف صاحب

آپ سے مخاطب ہوں گے۔ قیاس ہے کہ وُہ آپ کو نغمۂ ڈانس یا ستار وغیرہ سے محظوظ فرمائیں گے ...."
لطیف کو شہ دینے کے لئے خُوب تالیاں پیٹی گئیں۔ لطیف کو یکایک بڑا اچھوتا خیال سوجھا۔ جونہی وہ طوفان بدتمیزی تھما۔ اس نے بولنا شروع کیا "معزز حاضرین و حاضرات! نہ تو مَیں ستار نواز ہوں۔ نہ ڈانسر۔ نہ قوال نہ ریڈیو سنگر۔ اور نہ گراموفون سنگر۔ غرضیکہ گلے کی مشقت میرے بس کا روگ ہی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ رفیق صاحب نے میرے متعلّق حُسن ظن سے کام لیا ہے۔ دوستو! میں اَور تو کچھ نہیں ایک واقعہ عرض کروں گا" مَیں نے اپنی زندگی کے تین سال سانپوں میں بسر کئے ہیں۔ ہماری یُونیورسٹی کے شمال مشرق میں ایک دُشوار گزار جنگل واقع ہے" لطیف نے ایک لمحہ کے لئے توقف کیا۔ "رات بھیانک تھی۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اور مَیں گرو دیو کے پاؤں داب رہا تھا۔ گرو دیو کی جٹائیں اتنی لمبی تھیں کہ جب وُہ اپنے گدھے پر سوار ہونے تھے۔ تو وُہ لگام کا کام دیتی ہوئی معلوم ہوتیں برفیلی ہوا فرّاٹے بھرتی ہوئی درختوں میں سے گزر رہی

تھی۔ پتّوں، اور جھاڑیوں سے کچھ ایسی خوفناک سرسراہٹیں نکل رہی تھیں جیسے بیشمار سانپ بِل کر پھُنکار رہے ہوں۔ قریب ہی الاؤ میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔ شُعلے اُٹھتے اور اور ہوا کے زور سے اتنے جُھک جاتے کہ گرودیو کے چرنوں سے لپٹتے ہوئے دکھائی دیتے۔ قریب ہی ایک چیلا توے پر سانپ کے کباب بنا رہا تھا۔ ہم لوگ ابھی ابھی تین سانپ کھا چکے تھے۔ یہ آخری سانپ سب سے خوبصورت اور خوب موٹا تازہ تھا۔ مَیں دل ہی دل میں اس کے کبابوں کا مزہ لے رہا تھا۔ کہ گرودیو کی ناک کو حرکت ہوئی۔ گرودیو کی ناک اتنی ٹرینڈ تھی۔ کہ ایک میل محیط میں اگر کہیں کوئی سانپ بِل سے باہر نکل کر ہوا میں سانس لیتا۔ تو وہ فوراً حرکت میں آجاتی۔ یہ ایک قسم کا سگنل تھا۔ اور اس کا مطلب یہ تھا۔ کہ قریب ہی کہیں ایک یا بہت سے سانپ موجود ہیں۔ وہ مجھے ساتھ لے کر اس سمت چل پڑے جس طرف ان کی ناک چل رہی تھی۔ ابھی ہم تھوڑی دُور گئے تھے۔ کہ دو تین دردناک چیخیں بلند ہوئیں۔ وہ بولے "ہم نے دیر کردی۔

مرنے والوں کا خون ہمارے سر ہے۔ سانپ نے زہر داخل کر دیا ہے —— بڑے بوتے کا سانپ ہے۔ جو اس شدت کی سردی کا مقابلہ کر رہا ہے۔" جلد ہی ہم نے وہ خونچکاں منظر دیکھا —— وہ معصوم جوانیاں اپنی زندگی اور شباب کی بے وقت موت کا مرثیہ پڑھ رہی تھیں۔ ان کی ادھ کھلی آنکھیں پکار پکار کر ان حسرتوں کو گنوا رہی تھیں۔ جو پُر شباب اُمیدوں کی مسخ شدہ صورتیں ہوتی ہیں ——" سارے ہال پر خاموشی چھا گئی۔ لطیف بڑی سنجیدگی سے واقعہ بیان کر رہا تھا گرو دیوا الاؤ کی جانب لپکے، اور ایک عجیب و غریب زبان کا بھجن الاپنا شروع کیا۔ جلد ہی سردی کے مارے ٹھٹھرتے سکڑتے، گرتے پڑتے کئی سانپ الاؤ کی جانب رینگنے لگے۔ آخر میں لمبے لمبے خشک گھاس میں حرکت ہوئی اور ایک رینگتا ہوا بوڑھا اژدہا پھنکارتا ہوا قریب آ گیا۔ میں نے غور سے دیکھا اس کے بہت بڑے پھن پر ایک طاق سا تھا۔ جہاں کئی نیلے نیلے دھاگے تڑپ رہے تھے۔ گرو دیو نے اشارہ کیا اور میں نے

چابک دستی سے انہیں ڈبیا میں بند کر لیا۔ وہ ڈبیا اب بھی میری جیب میں محفوظ ہے۔ اگر کسی وجہ سے ڈبیا کا منہ کھل جائے۔ تو ان کی پھنکار سن سن کر چاروں طرف سے سانپ بھاگ کر چلے آتے ہیں۔ میں انہیں بڑی احتیاط سے رکھتا ہوں۔ چند روز ہوئے ایک محفل میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آ گیا تھا۔ دو ایک کو تو سانپوں نے ڈس بھی لیا تھا۔" لطیف نے جیب سے ایک پرانی سی ڈبیہ نکالی۔ حقیقت یہ تھی کہ لڑکے جو لطیف کا مذاق اُڑانے کو بالکل تیار بیٹھے تھے۔ اس ہاتھ کنگن کو آرسی کیا والے جملے پر چپکے ہو رہے۔ لطیف نے آخری الفاظ کہے "ان نیلے نیلے سانپوں کی ایک خاصیت یہ ہے۔ کہ ستار اور گھپ اندھیرے سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اور بڑا طوفان لاتے ہیں۔" لطیف سارے ہال پر سناٹا طاری کر کے ایک بوڑھے مفکر کی مانند سٹیج سے نیچے اُتر آیا۔ ارشد ستار کو بغل میں دابے کھڑا تھا۔ مگر سینے میں ہتھوڑے کی سی ضربات کا یہ عالم تھا۔ کہ اپنے فرض کو نباہنے کا ارادہ نہ کر سکا۔ رفیق نے میجک لنٹرن

صحیح زاویے پر جمائی .... لیکن جونہی ہال میں اندھیرا کرنے کی خاطر بٹن دبائے تو اس کے ہاتھ کانپ گئے۔ الطاف نے شہ دی "اماں سوچ کیا رہے ہو۔ اب شروع بھی کر دو۔" ہال میں اندھیرا ہو گیا اور سکرین پر مناظر تھرکنے لگے۔ ارشد سینیریاں بجانے لگا۔ چند ایک لمحوں کے بعد نغموں کے زیر و بم میں جھومنے لگا۔ خوبصورت رقص۔ دلکش حسن توبہ شکن جوانیاں ـــــ اور قدرت کی پاکیزہ و معصوم گود آبشار، دریا، پہاڑ، جھیلیں، وادیاں سب باری باری پوری سج دھج سے سکرین پر آمد و رفت کا نغمہ الاپ رہی تھیں ـــــ پھر ر۔ ر۔ ر ایک طرف روشنی سی ہوئی۔ اور اس کے بعد بگولے کی آواز کا تاثر جیسے سانپ پھنکار رہا ہو "سانپ۔ سانپ" ایک دو مہیب آوازوں سے اس ڈرامے کا آغاز ہوا۔ اس کے ساتھ ہی سارے ہال میں دوڑ بھاگ شروع ہو گئی۔ کرسیاں راستوں میں اوندھی ہونے لگیں ـــــ یکایک ہال میں روشنی پھیل گئی۔ لیکن وہاں نہ سانپ تھا نہ انسان، دونوں غائب تھے ٭

صبح صبح ناشتے کی ٹیبل لگی تو لطیف ذرا دیر سے پہنچا۔ باجی نے سہیلیوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ لڑکیوں کی نگاہیں اِس زور سے لطیف کی جانب اُٹھیں کہ وہ بوکھلا گیا۔ پریشانی کے احساس کو دبانے کے لئے باجی سے پُوچھنے لگا "باجی وہ بادام کے تین مغز —— یعنی رات کو بھگو دیئے تھے" آمنہ باجی کے کان کے قریب ہو کر کہنے لگی "لطیف صاحب ان کی نسوار بنائیں گے" —— باجی نے "بریچ بھر کائی۔ تین سفید سفید مغز سُرخ اور کثیف چھلکوں میں سے نکل کر لطیف کو گھورنے لگے "یہ دماغ کے لئے بڑا مجرب ٹانک ہے" لطیف نے حکیمانہ طرز تخاطب سے کام لیا۔ منوّر نے ذرا بلند آواز سے کہا "کیوں باجی! لطیف صاحب سارے کا سارا مال آج ہی کھا جائیں گے"۔ ... "آج ہی اور اکیلے۔ یہ مرد وے کم بخت بڑے پیٹو ہوتے ہیں۔ اور ہمارے لطیف بھیّا تو ان کے علاوہ بلا ناغہ ایک آدھ انڈا بھی پی جاتے ہیں" "میں کیا سمجھتا نہیں۔ دُودھ ملا کہو۔ دُودھ ملا۔ یعنی دُودھ میں کچّا انڈا ملا کر ..." "ہاں ہاں دُودھ میں کچّا انڈا ملا کر... آپ کو شاید پتہ نہیں۔ ہم نے بڑی مُشکل سے

..... لطیفؔ صاحب کو پہاڑ پر آنے کو تیار کیا ہے۔ خبر نہیں انہیں میدانوں کی آگ کیوں اس قدر عزیز تھی۔ خصوصاً ہمارے شہر میں تو شدّت کی گرمی پڑتی ہے۔ دوپہر کے بعد چیل بھی انڈا چھوڑ دیتی ہے۔" ......

"اور لطیفؔ صاحب پی جاتے ہیں۔" عصمت نے آہستہ سے کہا۔ ...... "دُودھ ملا کھو یعنی ......" لطیف سٹپٹا کر بولا۔ "بھئی تم نے تو محاذ قائم کر لیا ہے" ——— دفعتہً باجی ترُش رو ہو گئیں۔ اور لطیف سے استفسار کرنے لگیں۔ "لطیفؔ یہ رات کو کیا بک رہے تھے۔" لطیف کے چہرے پر رنگ آگیا۔ "دیکھا باجی۔ تم ہمیشہ فلسفے کے معاملے میں مجھ سے جُو تم پیزار پر آمادہ رہتی ہو۔ معمولی سی چالاکی سے جس نے سب شیطانوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ بڑے رفیق۔ حمید، الطاف۔ ارشد یہ اور وُہ لئے پھرتی ہو خدا کی قسم ایک ایک کو چڑا پھینکوں۔ منور حیران ہو کر پوُچھنے لگی "تو جو کچھ آپ نے کہا تھا وہ سب غلط تھا۔" عصمت کہنے لگی "اور آپ نے سانپ کے کباب بھی نہیں کھائے" ——— "سانپ کے کباب ؟" لطیفؔ ہنسنے لگا۔ "آپ بھی

واللہ کمال کرتی ہیں۔ مجھے تو اب تک جیتا جاگتا سانپ دیکھنے کی سعادت بھی نصیب نہیں ہوئی ——— باجی کہو تو اسی وقت ایک ایک تھیوری سے سب کی تواضع کر دوں"۔ عصمت کہنے لگی "اے باجی ہمیں تو اجازت دو۔ نسیم کو معلوم ہے کیا ہوا۔ رات کو ہال میں ایک کرسی سے اُلجھ پڑی۔ اندھیرا تھا نا۔ اور سانپوں کا خوف۔ بیچاری کا سر پھٹ گیا۔ اور اب تو بے ہوش پڑی ہے"۔۔۔۔ لطیف کا ہاتھ ٹھٹکا "اے یہ نسیم صاحبہ کون ہیں باجی"؟ ——— وہی جس سے آتے ہی اُلجھ پڑے تھے"۔ ——— منوّر تعجب ہو کر کہنے لگی" بھئی حیرت یہ ہے کہ ہیں نے بھی اندھیرے میں بل کھاتے ہوئے کئی سانپ دیکھے۔۔۔۔" لطیف کا سر اس سو فیصدی اقرار سے بلند ہو گیا۔ اس نے بڑی شان سے باجی کی جانب دیکھا "کیوں باجی تمہیں تو چھوٹے نظر آتے ہوں گے ——— کاش آپ نے فلسفہ۔۔۔۔" "فلسفہ پڑھیں ہمارے دشمن" ——— "اچھا باتیں نہ بناؤ۔ اور لپک کر نسیم کا پتہ لو"۔ لطیف میز پر ہنستا رہ گیا۔ لیکن کچھ دیر بعد خود بھی جا پہنچا نسیم کی ماں پائینتی پر بیٹھی گرم ترش ہو رہی تھیں۔ اور

نسیم سر پر پٹی باندھے خاموشی سے لطیف کی جانب دیکھنے لگی۔ خون کی کمی نے اس کے چہرے کو برف سا سپید بنا دیا تھا۔ اعضا کی قدرتی نزاکت اور اس پر نقاہت کے اثرات نے اس کی نسائیت کو معراج پر پہنچا دیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے کمزور عورت کو پسند کرنے کا عادی تھا۔ موٹی موٹی بھینسیں اس کے کھرے پن کو اُلٹا بڑھا دیا کرتی تھیں۔ اس نے جھجکتے ہوئے پُوچھا "کیوں باجی اب کیسی ہیں"—— "افاقہ ہے" نسیم کی ماں مُنہ پھُلائے بیٹھی رہی۔۔۔ الطاف۔ ارشد۔ رفیق آہستہ آہستہ اندر آئے اور یکے بعد دیگرے لطیف کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ "کیوں صاحب سُنا ہے وہ ڈبیا والا معاملہ نرا ڈھونگ ہے" رفیق نے لطیف کے ایک ٹھوکا دیا "اپنی کہو رات کیسی کٹی"—— باجی نسیم کو بتا رہی تھیں کہ لطیف نے محض مذاق کیا تھا۔ لطیف نے ہوا دی "اجی کس گدھے نے ایک بات بھی خدا لگتی کہی ہے میں عرض کر دوں وہ بالکل بکواس تھی یہ۔۔۔۔۔ یہ دیکھئے نا ڈبیہ۔ یہی ڈبیہ تھی نا۔ وہ رات والی جس میں نیلے نیلے سانپ بند تھے۔ پہچان لیجئے بالکل وہی ہے۔ مگر جب آپ اسے کھول کر دیکھیں گے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ اس میں مغز بادام رکھا

کرتا ہوں۔ دماغ کے لئے تو واللہ بڑی مجرّب چیز ہے۔ آپ بڑے شوق سے دو ایک ہفتے استعمال کر کے اس کی سحر کاری مُلاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اِس کے بے شمار فائدے ہیں"۔

بھلا جوانی اور فلسفے کا کیا میل۔ اور کیا جوڑ۔ زربفت کے ٹکڑے میں ٹاٹ کا پیوند۔ ات ٹٹّو والا کچھ دن سے انسانیت کا صحیح معیار نظر آنے لگا۔ جس نے محبّت کا گیت عین جوانی کی دوپہر میں گایا۔ وُہ اَن پڑھ اور نامعقول انسانی ٹٹّو راتوں کی تاریک فضاؤں میں مشعل لے کر اسے زندگی کا صحیح راستہ دکھایا کرتا۔ وُہ راہبر تھا۔ اس کا کام راہبری تھا —— اور ایک دن وُہ دونوں اسی معمّر تنے کے پاس پہنچے جہاں دیوار اور چیڑ کے بلند و بالا درخت آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ٹھنڈے اور شفاف پانی کا سرشور چشمہ چٹانوں سے گر گر جھاگ اُڑا رہا تھا۔ دُور ارد گرد پہاڑوں کی سرسبز و شاداب پہاڑوں کی دیواریں تھیں۔ لطیف تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نسیم بھی سستانے لگی۔ اِس حسین خطّے پر چند مبہم اور مسلسل آوازوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ لطیف کی آنکھیں ہوا کے ایک دلفریب جھونکے سے بند ہو گئیں۔ س کے خشک حلق میں کسی نے جیسے امرت کی بوندیں ٹپکا دیں۔

ایک دن یکایک اس کی رُوح زندہ ہو گئی۔ اس نے گرد و پیش کا بنظرِ غور مطالعہ شروع کر دیا۔ مگر اب یہ مطالعہ کسی سپاٹ خشکی سے ملوث نہ تھا۔ اسے کئی اندیشے سر اُٹھاتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ ان دوشیزہ پہاڑیوں کی گود میں زندگی مسکراتی ہے۔ مگر مسکراہٹ کا انجام ——— قہقہہ ہمیشہ گہری اور تفکر آمیز سنجیدگی کو راہ دیتا ہے۔ خندہ دلوں سے نسیم اکثر ماں کے ساتھ دیکھی جاتی تھی۔ شاید ـــــ ا بات کی بھنک کانوں میں پڑ چکی تھی:

ایک دن باقاعدہ پکنک کا انتظام ہُوا۔ کھانے پینے کے لوازمات کے علاوہ ستار۔ ہارمونیم وغیرہ بھی ساتھ رکھ لئے گئے۔ صُبح ہی صُبح پارٹی ہیپی ہاؤس سے نکلی۔ اور بلندی سے نشیب کی جانب اُترنے لگی۔ ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد وُہ جھیل کے کنارے پُہنچ گئے۔ مُلازم ضروریات لے کر پہلے ہی پہنچ چُکے تھے۔ جھیل کے کنارے ہریاول دبیز چاندنی بچھا رہی تھی۔ ایک موزوں جگہ تلاش کر کے ساری پارٹی سستانے بیٹھ گئی تھکے ہوئے اعضا پر ایک وجد انگیز موسیقی پھیلنے لگی۔ کسی نے دفعتاً ہارمونیم پر اُنگلیاں تھرکا دی۔ اور یہی طے پایا کہ ہارمونیم کے

ساتھ ذرا دیر کے لئے اودھم مچایا جائے وائلن یا ستار کے سُر اِس شدّت سے نہیں بدلتے کہ سُننے والا یہ محسوس کرے کہ کوئی پتھروں اور کنکروں کی پے در پے بوچھاڑ کر رہا ہے۔ یا بغیر سانس لئے چلنے پہ جانثار سید کئے جاتا ہے۔ اسی موضوع پہ بحث چل نکلی۔ لطیف کہنے لگا۔"پہلوانی گانوں کے لئے ہارمونیم خوب ہے۔ مثلاً قوالی لے لیجئے۔ اِس میں اتنا آرٹ نہیں جتنی مشقت ہے۔ گلا پھاڑنے کا عنصر زیادہ ہے۔ اِس لحاظ سے تو کوا بہترین قوال ہے۔ ویسے بھی کوّوں اور قوالوں میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً قوال اکثر چونچ بھی کالی پر بھی کالے کے مصداق ہوتے ہیں۔ طبع سلیم پر ان کی قوالی کا اثر بھی وہی ہوتا ہے جو کوّوں کی کائیں کائیں کا ۔ ۔ ۔ ۔"

"لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃ۔ لاکھوں میں ایک راگ ہے۔ اور اس کی تم نے وہ مٹی پلید کی کہ توبہ ہی بھلی۔ بھئی ہمیں دھرے دُبلے پتلے، کمزور، سہمے سہمے گانے ہر گز اچھے نہیں لگتے ان میں زندگی کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ بس موت ہی موت —— اور وائلن —— جب چھیڑ دو کم بخت رونا شروع کر دے گا جیسے ابّا جان کا انتقال ہو گیا ہو۔ یہ بھی کوئی ساز ہے"——

"تم نرے گاؤدی ہو۔ شیلے کہتا ہے۔ ہماری خوشی اور مسرت کے بہترین گیت وہ ہیں جن سے قنوطیت ٹپکتی ہے۔ اس لحاظ سے وائلن بہترین سازوں کی صف میں آجاتا ہے"...... ادھر ارشد نے تان اُٹھائی "ارے تم نے کب سے شیلے کو انسان سمجھنا شروع کیا۔ تمہاری نظر میں تو وہ ہونق درجہ اوّل تھا جو زمین پر رہتے ہوئے خلاؤں کی باتیں کیا کرتا تھا"——

رفیق کہنے لگا "اور تو اور اس۔ قت ستار کی تعریف بھی فرمائی جا رہی ہے۔ کیوں جی آرٹ کی اس نعش کی تعریف چہ معنی؟"—— لطیف نے آہستہ سے جواب دیا "یہ ردّعمل ہے" الطاف نے بات بڑھائی "کس شان کا بے معنی جواب ہے۔ فلسفہ کے یہ لال بجھکڑ لاجواب نہیں ہوتے۔ ہمیشہ ایسی ہی بے تکی ہانک دیتے ہیں۔ صاحب یہ میری نفسیات ہیں۔ اجی میں کیا۔ لاشعوری عمل۔ جناب میرا شعور اور تحت الشعور ......" "بھائی صاحب آپ فلسفے سے بالکل اس طرح نابلد ہیں جس طرح گدھا عقل سے ......" "اور جس طرح آپ انسانیت سے" الطاف نے گرم ہو کر کہا "سب فلسفی مسخرے ہوتے ہیں۔ دونوں پلڑوں پہ جھول جاتے ہیں——

نسیم کدھر ہے۔ وائلن تو اس کا محبوب ساز ہے۔ اور اگر ساتھ ہی ساتھ کوئی نغمہ بھی الاپنے لگے تو ...... واقعی نسیم ہے کہاں"۔ تشویش کی لہر سی دوڑ گئی۔ ایک لمحے میں سب نے سُن لیا۔ کہ "نسیم موجود نہیں ہے"۔ الطاف نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ دیکھتے کیا ہو کچھ ہاتھ پیر ہلاؤ —— لطیف سوچ رہا تھا۔ نسیم ایسی بھولی نہیں جو راستہ کھو دے۔ ضرور کوئی بات ہے۔ جھیل کے کنارے ذرا دُور بڑا دلفریب خم تھا۔ لطیف نے دیکھا۔ نسیم کنارے سے لگی ہوئی ایک ویران کشتی میں بیٹھی دُوسرے کنارے کو تک رہی ہے۔ وہ زور سے چلّایا۔ "نسیم یہ تم نے کیا کیا واللہ ہم تو گھبرا گئے تھے۔ کیا سوچ رہی ہو"—— "سوچتی ہوں کہ پیراکی سیکھ لوں"۔ ...... کیسے خیال آیا"۔ ...... خیال تو مجھے یونہی آیا کرتے ہیں —— میری خواہش ہے کہ بغیر کسی مدد کے تیر سکوں"—— "پھر؟" —— "بس تیرا کروں۔ حتیٰ کہ ایک دن بازو شل ہو جائیں اور پانی کی گہرائی میں چلی جاؤں۔ لیکن کسی کو مدد کے لئے نہ پکاروں"۔ ...... خیالات تو بڑے بلند ہیں"۔

تعجّب ہے ایک بسے ہوئے انسان کے خیالات تو کبھی

بلند نہیں ہوئے آپ لوگوں کی مدد اور سہارا مجھے اس سے کتنی چڑ ہے والدین بیٹی کو گھر سے اکیلے نہیں۔ ساتھ ایک سہارا دے کر۔ مبادا دکھ درد کمزور سمجھ کر نشانہ نہ بنالیں۔ کوئی مرد جب کسی عورت کی طرف دیکھتا ہے تو اس کی بڑی خواہش ہوتی ہے کہ عورت کو کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ فوراً امداد بہم پہنچا دے۔ گھڑی ہے۔ اور کچھ نہیں تو کم بخت گر ہی پڑے۔ تاکہ بازو پیش کر دے ـــــ فراڈ ڈھونگ ہے۔ سراسر دھوکا اور فریب۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے کوئی بھی حقیقی سہارا نہیں دے سکتا۔ اِس کے لئے صحیح سہارا یہی ہے۔ کہ اسے سہارے کی احتیاجی حدود سے بے نیاز کر دیا جائے..... " نسیم تم کیا کہہ رہی ہو" الطاف اور ارشد پہنچ گئے " واہ بھئی واہ، ہم تشویش کے مارے ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔ اور حضرت کیا آرام سے بیٹھے گفتگو فرما رہے ہیں" ـــــ " بھئی میں نے تو کتنی بار کہا چلئے صاحب کوئی مانے بھی ـــــ" جگہ پُر فضا تھی طے پایا سب یہیں اُٹھ آئیں۔ راستے میں لطیف اور باجی ذرا علیحدہ ہو کر چلنے لگے " نسیم کو کیا ہو رہا ہے باجی "..... سخت سُست سُن آئے ہونا۔

اس کی ماں بھی نرا زہر ہے۔ رات کو ماں بیٹی میں ٹھن گئی تھی"
..... "کیا کیا باتیں ہوئیں" ——— "کہہ رہی تھی۔ بڑی کڑوی کسیلی باتیں ہوئیں ......" لطیف نے خاموشی سے سر کو ایک دو جھٹکے دیئے۔ جیسے حالات کی تہ تک پہنچ رہا ہے +

لطیف کو کتابوں کا خیال آیا۔ اِس کو احساس ہُوا کہ یہ دن یونہی ضائع ہو گئے۔ اِس عرصہ میں وہ قریباً دو درجن کتابیں ختم کر سکتا تھا۔ دو چار کتابیں لے کر ہیپی ہاؤس سے نکلا اور چٹانوں کے ایک چبوترے پر جا بیٹھا۔ فضا میں کُشادگی تھی اور منظر میں دلبستگی۔ آس پاس دُور و نزدیک کئی ایک مکان صُبح کی تازہ دھوپ میں نہا رہے تھے۔ اس نے مطالعہ شروع کر دیا ——— اُس کا سایہ مغرب سے مشرق کی طرف آ پہنچا۔ پرندوں کے غول اُونچے اُونچے درختوں پر آ بیٹھے۔ اور اس قدر شور کرنے لگے کہ اسے اپنی خوابِ آلود اور بوجھل نگاہیں اُٹھاتے ہی بن آئی۔ نسیم ساڑھی سنبھالتی بڑی تیزی سے اس کی جانب آ رہی تھی۔ قریب آتے ہی بول اُٹھی: "میں نے سُنا ہے۔ آج آپ نے کھانا نہیں کھایا"
..... "ہائیں واقعی، ایک بجے کے قریب مجھے خیال تو

آیا تھا۔ لیکن ...." "آپ کرتے کیا رہے ......"
"کچھ نہیں دماغ کو زنگ لگ گیا تھا۔ مانجھ رہا تھا۔ پہاڑوں کی آب و ہوا مرطوب ہے نا" —— "زنگ کٹ گیا"——
"نہیں تو"....... "کل میرے اعصاب پر بہت بُرا اثر تھا"
—— "مجھے آپ سے ہمدردی ہے" —— "مَیں آپ سے اُلجھ پڑی تھی" ...... "کچھ ایسی تو نہیں" —— "باجی نے آپ کو میری امّاں کے متعلّق بہت کچھ بتا دیا ہوگا" نسیم ناخونوں کو توڑ رہی تھی —— "ہاں کچھ کہہ تو رہی تھی"
—— "لیکن اب میں باغی ہوں" ..... "لطیف بڑ بڑا اُٹھا" باغی ہوگئی ہو۔ تم احمق ہو۔ کل تم نے کشتی میں بیٹھ کر تو بڑی اچھی اچھی باتیں کی تھیں۔ اس وقت تم میری دانست میں دُنیا بھر کی قابل ترین فلاسفر تھیں۔ اگر تم ہمیشہ کے لئے کل والی نسیم بن جاؤ۔ تو مَیں تمہاری پرستش شروع کر دوں"
...... "اوہ شکریہ!" ...... فلسفہ زندگی کا بڑا معتدل رستہ ہے۔ تم ہنستے ہو تو تمہارا رونے کا سامان ہوتا ہے۔ تم روتے ہو تو ہنسی خوشی کی بُنیاد رکھتے ہو۔ لیکن جب تم سوچتے ہو تو ان سب جھنجھٹوں سے آزاد ہو جاتے ہو۔ فلسفہ بڑا

معتدل ہے۔ اس میں غمی خوشی کی بجائے ایک تیسری چیز پائی جاتی ہے۔ اس کا نام ہے سرور —— رُوح کی غذا۔ سرور میں رُوح کے لئے وٹامن بڑی افراط سے ملتے ہیں..... تمہارا کل والا نظریہ خدا جانے مجھے بڑا پسند آیا۔ یُونیورسٹی میں میرا آیندہ لیکچر سہارا ہو گا —— تم اپنی باتوں کو خود نہیں سمجھ سکیں جب خوب سمجھ لو۔ مجھے لکھ دینا۔ لکھو گی نا۔ ہوں.....“ لطیف کے لہجے میں پیار تھر تھرانے لگا۔ نسیم کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے چھلک پڑے ”روتی ہو۔ پگلی۔ وعدہ کرو —— لکھو گی نا۔ مَیں یُونیورسٹی برابر جا رہا ہوں۔ شاید کل ہی چلا جاؤں“۔

وُہ رات بھر مسافروں کی ریل پیل میں اُونگھتا۔ پہلو بچاتا۔ اِنٹر کلاس میں دھکّے کھاتا رہا۔ جب کہیں رات ڈھلنے لگی۔ اور اس کا سٹیشن آگیا۔ کتابوں کا ایک بیگ، دُو سُوٹ کیس اور ایک چھاتا کُل چار چیزیں تھیں۔ قُلی سے بیگ اور سُوٹ کیس اُٹھوا کر پلیٹ فارم سے باہر نکلنے لگا۔ تو اسے یُوں معلوم ہُوا۔ کہ کوئی چیز کم ہے۔ قُلی سے ذرا ٹھہرنے کو کہا۔ اپنے ڈبّے کی طرف پلٹا۔ تیزی سے کمرے میں گھُسنے لگا

تو چھاتے نے بڑھ راستے کے روڑے کا کام دیا۔ لطیف نے اس بدحواسی میں ایک طرف کیا۔ اور مسافروں کی اشیاء کو اُلٹنے پلٹنے لگا۔ چند ایک اونگھتی ہوئی صورتوں نے خفا ہونے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ باوجود کافی تلاش کے اُسے ناکامی ہوئی۔ اس نے ایک ریلوے ملازم سے شکایت کی "کیا گم ہُوا ہے آپ کا" لطیف اُلٹا سیدھا ہونے لگا "دیکھئے صاحب ابھی ابھی مجھے خُوب یاد تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے دل میں ہے۔ پر زبان پر ۔ ۔ ۔ ۔ اوہ یاد آیا۔ چھاتا صاحب چھاتا" ــــــ "بہتر یہ ہے کہ آپ ریلوے کی کتاب میں درج کرا دیں" وُہ رُک گیا "میں پُوچھ سکتا ہُوں کہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔" لطیف کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا "اوہ معاف کیجئے گا۔ میں بھی حیران تھا۔ کہ وُہ کونسی چیز تھی جس نے ڈبّے میں داخل ہوتے ہوئے رُکاوٹ ڈالی تھی" گیٹ پر ٹکٹ بابو نے ٹکٹ مانگا۔ تیزی سے بٹوا نکال کر چھان بین میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد جیبوں کی تلاش ہوئی۔ تین چار منٹ کی سخت مشقّت کے بعد کہنے لگا "معاف کیجئے گا بابو جی۔ یُوں معلوم ہوتا ہے کہ میں نے ٹکٹ نہیں خریدا ۔ ۔ ۔" "حیرت ہے لیکن کیوں؟" ــــ

واقعہ یہ ہے کہ چند دن ہوئے مَیں نے ایک سفر کیا تھا۔ اس دن ٹکٹ میں نے خود ہی خریدا تھا۔ اور ٹکٹ خریدتے ہوئے مجھے بڑی تکلیف کا سامنا ہوا۔ آج جس وقت میں اس گاڑی میں بیٹھا۔ تو مجھے یہی خیال تھا کہ میں نے ٹکٹ خرید رکھا ہے۔ اور مَیں نے غلطی سے ..... یعنی مجھے اسی دن کا خیال رہا۔ .....‘‘ ’’یہ کیا بات ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ لاطینی بول رہے ہیں۔ مَیں تو آپ کی ایک بات نہیں سمجھ سکا۔‘‘ لطیف نے جھنجھلا کر کہا ’’اُف، میں پاگل .... پھر اسے ٹکٹ بابُو پر بڑا رحم آیا اور ذرا نرمی سے کہنے لگا ’’کاش آپ نے ——— خیر آپ کرایہ لے لیجئے۔‘‘

تاج
کمپنی لمیٹڈ
لاہور کراچی